

فائزہ افتخار



آج ہی یہاں برقی قمیضے سجائے گئے تھے۔
سارا گھر جگر جگر کر رہا تھا۔

وہ رات کے اس پہرے۔ اس آخری پہرے۔ جب باقی
سب تھک ہار کے جہاں جگہ ملی وہاں سوچکے تھے، اکیلی
ٹیرس پہ کھڑی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں
جھانک رہی تھی۔

آج ہی اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ہاں شادی
سے ہفتہ بھر پہلے ہی مایوں بٹھاوینے کا رواج تھا۔ دن
میں محفل میلاد تھی۔ تقریباً سب ہی عزیز واقارب
موجود تھے۔

شام کو جب اسے مایوں بٹھایا گیا تو کتنی رونق تھی
یہاں۔ چھوٹا سالان بھرا پڑا تھا۔ لڑکے والوں کے ہاں
سے میلاد اور مایوں کی سادہ سی گھریلو تقریب میں
شرکت کے لئے صرف چار خواتین آئی تھیں۔ لڑکے
کی والدہ پچھوٹی بہن جو شادی شدہ تھی، ایک پھوپھی
اور ایک خالہ، ان کے باقی رشتہ دار دوسرے شہروں میں
رہتے تھے ان کی شمولیت بعد کے فنکشنز میں ہونا
تھی۔

وہاں سے صرف چار عورتوں کے آنے کے باوجود
رونق خوب لگی۔ اس کی بہنیں اپنی نندوں، دیورانیوں

ناولٹ



حسین پینا۔

وہ اپنے وجود سے پھوٹنے والی ایشی اور ہندی کی
نرالی آن چھوٹی مہک سے بھی بے نیاز تھی۔

ٹھنڈی جالی سے ٹیک لگائے وہ ٹیرس کے پار
نجانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

اماں نی، میری غنڈیں بھاگیں
مجھ سے کوسوں دور

اماں نی، میرے سنے ٹوٹے
چھ گئی یسے پھانس

اماں نی، میں پیاس سے تڑپی
دل دریا کے پنج

اماں نی، میری سنے نہ کوئی
ہاری کر کر مین

اماں نی، میری شستی ڈوبی
عین کنارے پاس

اماں نی، میرے اندر بادل
بارش رو کے کون

اماں نی، میں نے چاند چرایا
جیون ہوا اندھیر

اماں نی۔۔۔

”مسور!“ امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”تنی مگر ٹھنڈ (خ سردی) میں تو یہاں کیوں کھڑی
ہے اور وہ بھی اس وقت سحری ہونے والی ہے اب تو۔“

نہ کوئی سوئے نہ نہ جرائیں، ہلکی سی شال لے کر کھٹے سر
کھڑی ہے۔ کچھ عقل بھی ہے یا نہیں۔ سرسوں کا

تیل بھی لگا ہوا ہے سر میں۔ پتہ بھی ہے کہ رات کو تیل
بالوں میں لگا رہے تو جھجے نزلہ ہو جاتا ہے۔ اب سر نہیں

دھو سکتی تو اسے ڈھانپ کے تو رکھ سکتی ہے۔“

اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ وہ بستر کی چادر بدلتے
ہوئے ساتھ ساتھ اسے لیکچر دے رہی تھیں۔

”بچھی رہنے دیں یہی۔ اسے کیا ہے؟“ وہ
بے زاری سے بولی۔ شاید اسے اپنی تنہائی میں یہ مداخلت

اچھی نہیں لگی تھی۔

اور جھٹائیوں سمیت موجود تھیں۔ خاندان کی
”چیچوں“ ممانیوں، خالوں کے ساتھ ساتھ درجن بھر
کتواری اور آدھ درجن شادی شدہ کزنز بھی بال بچوں
کے ساتھ موجود تھیں۔ خود اس کی دوستیاں بے حد
محدود تھیں۔ امی نے تو کہا تھا کہ وہ اس موقع پر جتنی
دوستوں کو چاہے مدعو کر سکتی ہے لیکن وہ سوچ میں
پڑ گئی تھی۔

جان پہچان اور اچھی بات چیت تو کلاس کی سب ہی
لڑکیوں سے تھی۔ مگر خاص دوستی بینش کے علاوہ کسی
سے نہ ہو پائی تھی۔ اس میں بھی زیادہ ہاتھ بینش کا تھا
جب سے کالج چھوٹا تھا اس نے بہت سی کلاس فیلوز
کے نمبرز موجود ہونے کے باوجود ان سے رابطہ کرنا
ضروری نہ سمجھا تھا۔ یہ بینش ہی تھی جو دوسرے
تیسرے دن فون بھی کر لیا کرتی۔ اور مہینے میں ایک
آدھ چکر بھی لگاتی، ورنہ وہ ہوتی اور اس کا کمرہ گھر کے
گنے جتنے کام جو اس کے ذمے تھے، انہیں وہ خاموشی
سے نمٹاتی اور کمرہ بند کر کے رسالوں، ڈائجسٹوں کی دنیا
میں گم ہو جاتی۔ بینش کی وجہ سے کبھی کبھار اسے اپنے
خول سے باہر آنے کا موقع ملتا تھا۔ اسی لیے امی کو بینش
کا آنا اچھا لگتا تھا۔ ابھی بھی اس کی شادی کی تاریخ
ٹھہرتے ہی انہوں نے بینش سے بھدا اصرار کہا تھا کہ وہ
شادی سے کچھ دن پہلے ہی ان کے ہاں آجائے۔ سو آج
سے وہ اپنے کپڑے وغیرہ لے کر آچکی تھی۔ ڈھولک
کے بعد چائے پی کر بجائے تازہ دم ہونے کے بعد سب
ہی لڑکیاں ادھر ادھر لڑھک کر سو چکی تھیں۔ ایک وہی
تھی جو امی اور باجی کے ساتھ پھیلاوا اسمیٹ رہی تھی۔
جھوٹے برتن، شکن کی مٹھائی، میوے اور ایشی کے
تھال۔ خالی بوتلیں وغیرہ۔

اس کی نظریں اب تک لان کے درختوں سے لٹکتے
اور بیرونی دیوار اور گیٹ کے ساتھ ساتھ لگے
خوبصورت رنگین برتن، مٹھائیوں پر جمی تھیں۔ اس
کے باوجود اس کی آنکھوں میں نہ تو ان روشنیوں کا کوئی
عکس تھا نہ ہی اسے والے دنوں کے حوالے سے کوئی

”پتہ نہیں کس کے بد تمیز نیچے بستر پہ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ کل میں نے نئی ٹکڑ بچھائی تھی کہ تیرے کمرے میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا اور یہ دیکھ سالن گرا دیا ہے کسی نے۔“ انہوں نے لپک جھپک دو سری گہرے رنگوں والی دھاری دار بیڈ شیٹ بچھادی اور وہ ہلکی گلابی اور سفید چادر گول مول کر کے بغل میں دبالی۔ ان کے ہاتھوں میں اب ایک ٹرے تھی جس میں سویرا کے کمرے میں ادھر ادھر پھیلے گلاس کپ اور پلیٹیں رکھی تھیں۔

”گرل بند کر کے اندر آ جا۔ سارا برآمدہ ٹھار (ٹھنڈا) دیا ہے تو نے۔ نیچے ہال میں تو ہیش تک لگا ہوا ہے اور تو ہے کہ رات کے ساڑھے تین بجے کھڑکیاں دروازے کھول کے بغیر گرم کپڑوں کے کھڑی ہے۔ ٹھنڈ لگ گئی تو مصیبت۔ شادی میں دن کتنے رہ گئے ہیں۔ دو دن بعد تیری مندی ہے۔ اور سب سے بڑی بات مایوں کے بعد ویسے بھی ننگے سر کھلے آسمان کے نیچے آنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ہوائی چیزوں کا سایہ ہو جاتا ہے۔“

وہ اپنی عادت کے مطابق ڈھیروں کے حساب سے نصیحتیں کرتی رہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق سر ہلاتی رہی۔

”بینش کو میں نے کہا ہے تیرے لیے چائے بنا رہی ہے۔ میں ساتھ میں کاجو پستہ بھیجتی ہوں۔ تیرے سرال والوں نے بڑے عمدہ میوے بھیجے ہیں۔ سارے واہ واہ کر رہے ہیں۔“ جاتے جاتے انہوں نے مزید کہا۔

نہ تو سرال والوں کے نام پہ سویرا کا رنگ گلابی ہوا، نہ دو دن بعد ہونے والی مندی کے تذکرے نے اس کی دھڑکنیں تیز کیں۔ وہ پونسی شمس بیٹھی رہی۔ اسے اپنے کمرے میں بینش کی متوقع موجودگی پہ بھی الجھن محسوس ہو رہی تھی حالانکہ بینش کی محبت اور خلوص پہ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ مزاجاً اس سے مختلف تھی اور بے شک اس کی شوخیوں میں اس

کا ساتھ نہ دے پاتی تھی پھر بھی اس کی دلچسپ باتوں کو انجوائے ضرور کیا کرتی۔

آج وہ بینش کا تو کیا اپنا سایہ بھی برداشت نہیں کیا رہی تھی۔ وہ اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ اتنی اکیلی کہ اس کی کوئی سوچ، کوئی یاد تک اس کے آس پاس نہ بھٹکے۔

”کیا سوچ رہے ہو دو دن کے مہمانو؟“ بینش کی شوخ آواز نے اس کی آمد کا اعلان کیا۔

مگر وہ رخ بدلے بغیر دیوار کی جانب کروٹ لیے لیٹی رہی۔

”میرے خوابوں میں جو آئے

آکے مجھے چھیڑ جائے

اس سے کہو میری نیند نہ چرائے“

بینش نے چائے کے کپ پہ چچہ بجا کے اپنی شریر آواز میں گیت چھیڑا اور سویرا کی بے زاری عروج پہ پہنچ گئی۔

”کیسا ہے، کون ہے وہ جانے کہاں ہے۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

اسکی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو (سائیکالوجی)

شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق، آفٹ چھپاؤ، مضبوط جلد،

قیمت 450 روپے

پتا ذیل سے خریدیں

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ، اردو بازار کراچی

• احمد نیوز ایجنسی، فریئر مارکیٹ کراچی

• سلطان نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ لاہور

• اشرف بک ایجنسی راولپنڈی • مہران نیوز ایجنسی حیدرآباد

• مدیہ بک سٹور ملتان • مکتبہ عمران ڈائجسٹ کراچی

37 اردو بازار

جس کے لیے میرے ہونٹوں پہ ہاں ہے۔

اپنا ہے یا بیگانہ ہے وہ۔

سچ ہے یا کوئی افسانہ ہے وہ۔

”بینش پلینز۔ پلینز خاموش ہو جاؤ۔“

اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے بسی تھی۔ جسے بینش نے محسوس کیا تو اس کے گنگنا تے لب خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ کیا ہے سویرا! تم صبح سے عجیب طرح سے ری ایکٹ کر رہی ہو۔ اس قدر چڑچڑی ہو رہی ہو۔ کسی سے بھی ڈھنگ سے بات کر رہی ہو نہ ہی منہ کے زاویے درست ہو رہے ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھر پڑا ہے۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ تمہارا یہ رویہ لوگوں کو سوتا میں بنانے کا موقع دے سکتا ہے۔ ابھی اتنی بھی یہی خدشہ ظاہر کر رہی تھیں۔“

”امی تو بس۔۔۔ سویرا نے سر جھٹکا۔ ”کوئی نہیں باتیں بناتا۔ سب مجھے عرصے سے جانتے ہیں اور سب ہی کو پتا ہے کہ میں ایسی ہی ہوں۔“

”ہاں ہاں پتہ ہے سب کو۔ اور مجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ جناب بڑی سنجیدہ خاتون اور مدبر لی بی ہیں۔ فضول کی کھی کھی اور بے کار کاٹنسی ٹھٹھول آپ کو پسند نہیں۔ زیادہ کھلنے ملنے اور بے تکلف ہونے کی آپ عادی نہیں۔ بلاوجہ مسکراتا بغیر کسی بڑی بات کے خوش نظر آتا یہ سب آپ کے نزدیک اسراف کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن محترمہ سویرا عابدہ صاحبہ! سنجیدہ اور آدم بیزار ہونے میں اور رنجیدہ و طول ہونے میں بہت فرق ہے۔ زیادہ منہ لٹکا کے بیٹھو گی تو سب یہی سمجھیں گے کہ یہ شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہو رہی ہے اور ضرور تم کسی دوسرے لڑکے کے چکر میں ہو۔“

”نکو اس مت کرو۔“

”جی کہہ رہی ہوں! آپ کے خدشے بالکل درست ہیں۔ کسی کو بھی شک ہو سکتا ہے۔ وہ تو اتنی ہاں ہونے لگتی ہے کہ اس میں دوسرے ہونے کے نالے نہیں ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم اور کچھ بھی کر سکتی ہو حتیٰ کہ کسی

کو قتل تک کر سکتی ہو مگر کسی سے محبت ناممکن۔ ورنہ یہ جو ساڑھے بارہ تمہاری شکل پہ بچے ہوئے ہیں یہ کسی کو بھی شک میں ڈال سکتے ہیں۔“

”تو کیا کروں میں؟“ وہ بے چارگی سے کہہ اٹھی۔

”سویرا! خشک سے خشک ترین مزاج والی لڑکی کے خوابوں میں بھی ان دنوں بہار آجاتی ہے۔ کیا واقعی تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”یا پھر تم بنتی ہو۔۔۔؟ یا۔۔۔ یا خواب دیکھنے سے کتراتا ہو“ یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ کم آن یا۔۔۔ سوچو۔ سوچو کیسا ہو گا وہ؟ کیسا نظر آتا ہو گا۔ اس کی عادتیں کیسی ہوں گی؟“ بینش نے اس کے اندر اشتیاق جگانا چاہا۔

”میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے وہ جیسا ہے ویسا ہی ہو گا۔ جیسی عادتیں اللہ نے اس کی بنائی ہیں ویسی ہی ہوں گی۔“

”تو بہ کتنی پور ہو تم۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔

”میری دوستوں میں تم پہلی ہو جس کی شادی ہو رہی ہے۔ مگر ذرا مزہ نہیں آ رہا۔ نہ کوئی شوخی شرارت۔ نہ کھٹی میٹھی باتیں۔ نہ کوئی رنگین خوابوں کا ذکر۔ بڑی ہی ”بلیک اینڈ وائٹ“ سوچ ہے تمہاری۔ اور تو اور تصویر تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ بھلا کیا جاتا دیکھنے میں۔۔۔ وہ لوگ خود دے کر گئے تھے نا! آج کل تو شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کی باقاعدہ ملاقاتیں تک کرائی جاتی ہیں چاہے شادی ارنج ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسرے کو شادی سے پہلے جان لینے میں اور اچھی طرح سمجھ لینے میں کوئی برائی نہیں۔“

”ضروری نہیں۔“ سویرا نے اختلاف کیا۔

”کبھی کبھی پہلے سے کچھ جان لینا کسی کے حق میں برا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔“

”ساری رات جاگنے کے بعد انسان کو کوئی بات دیر سے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ سو جاؤ اب اور مجھے بھی

سوتے۔۔۔

اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے لیٹنے کی تیاری کی اور اس سے پہلے کہ بنیش کوئی اور سوال کرے اس نے کبل منہ تنگ کر لیا۔



دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

بھلے گھروں میں اس وقت یہاں کام کاج سے فارغ ہو کے بچوں کے لیے روٹیاں توڑے پہ ڈال رہی ہوتی ہیں جن کے اسکولوں سے آنے کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن یہ گھر ان گھروں میں سے تھا جہاں نہ تو کھانے پینے کے کوئی وقت اور اصول مقرر تھے نہ صفائی ستھرائی کے۔

اس گھر کی سب سے بزرگ ہستی دادی تھیں جو صحن میں رکھی چارپائی پہ بیٹھی گندیریاں چوس رہی تھیں۔ نیچے اینٹوں کے فرش پہ پھوک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جن میں پاز، ہلسن اور آلو، مٹر کے چھلکے بھی شامل تھے۔ چارپائی کے بڑے سے رنگین پائے کے نزدیک زمین پہ تانبے کا بڑا سا گلاس لڑھکا ہوا تھا۔ جس میں سے باقی بچی ہوئی اسی زمین میں جذب ضرور ہو گئی تھی لیکن اتنی جگہ پہ اور گلاس کے کناروں پہ کھیاں جھنجھٹا رہی تھیں۔ کھلے آنگن میں صرف یہی ایک چارپائی نہیں تھی بلکہ تین چار اور چارپائیاں بھی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ لہذا وہ کھلے صحن میں پیڈسٹل فین لگا کے چارپائیوں پہ سوتے ہوئے تھے۔ عموماً ذکیہ کے پیچھے چلانے پہ آٹھ نو بجے تک حمیرا برے برے منہ بناتی اٹھتی اور بستر تہہ کر کے چارپائیاں برآمدے میں کھڑی کر دیا کرتی یا پھر دس ساڑھے دس بجے صفائی والی ماسی دیناں آ کے یہ فریضہ انجام دیتی۔ مگر آج نہ تو ذکیہ گھر پہ تھی نہ ہی دیناں ابھی تک لوٹی تھیں اس لیے دوپہر ایک بجے تک چارپائیاں بھی پڑی رہیں اور لگن پہ کھڑے بستر پر ذکیہ نے جانے سے پہلے اپنی چارپائی پہ بیٹھ کے جو ناشتہ کیا تھا اس کے برتن تک جوں کے توں پڑے تھے۔ کچنوں کا ایک خزانہ بھی اسی طرح اڑا رہا تھا۔

ذکیہ کو صبح صبح مانگا منڈی جانا پڑا تھا۔ جہاں اس کی ایک قریبی سہیلی کی ساس کا چالیسواں تھا۔ ایسی کتنی ہی قریبی اور پکی سہیلیاں تھیں ذکیہ کی جن سے اس کی ساس ناواقف تھی۔ کچھ تو ہمیں بوریا والہ کی رہنے والی تھیں ان کے ہاں بھی آنا جانا لگا رہتا۔ یا ان میں سے کوئی نہ کوئی آتی رہتی۔ ایسا نہ ہوتا تو ذات برادری میں کوئی کم ملنا ملانا تو نہیں تھا ذکیہ کا وہ گھومنے پھرنے کی شوقین تھی۔ سو گھر پہ نیک کے اس سے بیٹھانہ جاتا۔ کیا سسرال گیا مہکم۔ کیا محلے داری گیا دوستی۔ ہر جگہ اس نے تعلقات بنا کے رکھے تھے۔ دور پرے کے اور دو سرے شہروں و سماؤں کے رہنے والوں کی خوشی غمی میں بھی لازماً شریک ہوتی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا شوہر عابد چودھری کویت میں تھا۔ سات آٹھ سال ہو گئے تھے اسے ملک سے باہر گئے ہوئے۔ سب سے چھوٹی والی بلی ابھی گود میں تھی جب عابد کا ویرا لگا۔ تب سے اب تک کویت کے دینار آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کے پاکستان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں نئی نئی خوشحالی آئی تھی۔ مرد کی جانب سے پابندی نہ تھی۔ بچوں کی ذمہ داری بھی خاص نہ تھی بوڑھی ساس رکھوالی کے لیے موجود تھی۔ اس نے تنہائی سے فرار کا اور دل بہلانے رکھنے کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ ویسے بھی جب اچانک پیسہ آجائے تو اپنے سے کم حیثیت والے رشتے داروں کے ہاں جا کر ملنے میں الگ ہی لطف آتا ہے۔ اپنے قیمتی لباس اور زیور دکھانے کا لطف۔ او بھگت کروانے کا لطف۔ ذکیہ میں غور یا اگر نہیں تھا۔ ہاں وہ ذرا خوشام پسند اور دکھاوے والی ضرور تھی۔ اس نے غریب عزیزوں سے ملنا بھی ترک نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے ہاں جاتے ہوئے کبھی پھل، کبھی مٹھائی اپنے بچوں کی پرانی اترن لے جاتا یہ سب اس کی نمائشی فطرت کو تسکین دیتا تھا۔

چار بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا فرخ، جو دن چڑھے سو کر تب اٹھا تھا جب اس کی ماں کو گھر سے نکلے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ بازار سے حلوہ پوری کا ناشتہ کر کے آنے کے بعد وہ اس وقت چھت پہ چڑھا پتنگ

نہیں بنایا تھا۔ وہ کام کرنے والی لڑکی دین کے ساتھ اپنی سیلیوں کے ہاں چلی جاتی۔ اگر دیر تک رکنے کا پروگرام ہوتا تو دین چھوڑ کے واپس آجاتی۔ آج بھی خمیرا کا زیتون کے ساتھ بازار جانے کا پروگرام بناتا تھا اور دین اب تک نہ آئی تھی اس کے نہ آنے کی وجہ سے دوپہر کے ایک بجے تک صفائی کا باقی کام بھی ویسا کا ویسا پڑا تھا۔

ہر جانب جھنپھناتی کھیاں، بکھرے تکیے، چارپایوں سے نیچے جھولتے کھیس اور سمنی چادریں، جھولنے برتنوں کا ڈھیر۔ یہ سب دیکھ دیکھ کے دادی کا دم الجھ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کے بھوک بے تاب کر رہی تھی۔ ”وے فرخا۔“ دادی نے گردن اونچی کر کے اپنے پیچھڑوں کا پورا زور لگا کے پوتے کو آواز دینے کی کوشش کی۔ لیکن اوپر مئے ”بو کاٹا“ کے بلہا کار میں اس کی نالواں آواز کہاں پہنچ سکتی تھی۔ ”ککھ ککھ ککھ نہیں بچتا اس گھر کا۔“ تھک ہار کے پیش گوئی کی۔

”بیچارہ پردیس میں مزدوریاں کر کر کے اپنا لو‘ مشینوں میں ڈال کے انہیں لمبی لمبی رقیں بھیجتا ہے‘ اور ادھر نہ گھر والی کو قدر ہے نہ اولاد کو پروا“ آوے کا تو ا بگڑا ہوا ہے۔“

دن میں تین چار بار وہ اسی طرح دل کی بھڑاس نکال لیا کرتی تھی۔ چاہے کوئی سننے والا ہو یا نہیں۔

”ذکیہ نامراد کو تو سیرپاٹوں سے فرصت نہیں۔ حمیرا کو بھی اسی کام پہ لگا دیا ہے۔ وہ تو شکر ادا کرو پھو پھی کا جو آنکھوں دیکھی تمکھی نکل رہی ہے۔ میری بیٹی ہے نا“ ماں کے کہنے پہ۔ اور بھائی کی محبت میں اس کی لڑکی مانگ بیٹھی ہے۔ جس کا نہ منہ نہ تھا۔ اور نہ کوئی گھر داری۔ نہ سلیقہ نہ کٹھن پٹی کرا کے سہیل پنا (دوستیاں) کروالو بس۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ لڑکا ہے تو وہ اک نمبر کا اتھرا (اڈمل) الف کا بے نہیں پڑھا۔ سڑکیں نانے، پتلونیں گنے اور باپ کی کملی اجاڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ ہزاروں روپیہ بھیجتا ہے اور ایسا بد نصیب گھر ہے جس کے چولے ٹھنڈے پڑے

بازی کا شوق پورا کر رہا تھا۔ بہن بھائیوں میں اس کا نمبر دو سرا تھا۔ پندرہ سال کا تھا مگر کاٹھی مضبوط اور اٹھان اچھی تھی۔ خوش خوراک اور بے فکری نے اچھی صحت عطا کی تھی۔ آس پاس کے رہنے والے اپنی عمر کے لڑکوں کے مقابلے میں وہ خاصا بڑا لگتا تھا۔ مزاج کا تیز تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کا منہ چڑھا بھی تھا۔ جس عمر میں بچوں کو ماں کے لاڈ کے ساتھ ساتھ باپ کی سختی اور سرپرستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس عمر میں باپ پیسے کمانے کے لئے اولاد کو ماں کے حوالے کر گیا۔ اور ماں کو جب بھی سفارتی دوروں سے فرصت ملتی، بے پناہ لاڈ پیار کے ذریعے کسر پوری کر لیتی۔ اسی وجہ سے آنھویں کے بعد جب اس نے اسکول جانے سے انکار کر دیا تو ماں سختی نہ کر سکی۔ ویسے بھی آنھویں میں اس نے تین سال تو لگا ہی دیئے تھے۔ اب ایک سال سے وہ گھر میں آدھا دن سو کر یا پتنگ بازی کر کے گزارتا اور باقی کا دن گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کے۔

اس سے ڈیڑھ سال بڑی حمیرا تھی۔ بڑی ہونے کے ناتے وہ بھی گھر کے ہر معاملے میں ذکیہ کی مشیر تھی۔ ماں کی طرح اسے بھی دوستیاں گانتھنے کا خاصا شوق تھا۔ ذکیہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے ناشتے کے جھولے برتن دھونے یا صحن میں جھاڑو لگانے، بستروں کو تہ لگانے والی کسی بدایت پہ عمل نہیں کیا جو ذکیہ جاتے ہوئے سرسری طور پہ کر لیتی تھی۔ فرخ ناشتہ کرنے جھورے حلوائے کی دکان پہ جا چکا تھا، اسے بازاری کھانے کی چاٹ تھی۔ دادی کو اس نے ماں کے ساتھ ہی نمٹا دیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے اس نے رنگ گورا کرنے والی کریم اپنے سانولے چہرے، مثالی گردن اور نرم ہاتھوں پہ جی بھر کے تھوپی، پچھلی عید پہ سلوایا گیا جارحٹ کا میوٹ سوٹ پہن کر اسی گھر کی لپ اسٹک لگائی۔ پھل والے کاجل سے آنکھوں کو کنار اکیا اور اونچی ٹیکل والی سینڈل پہن کے دین کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اسے گھر سے اکیلے نکلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے اس وجہ سے باپ کی گھسیٹا اور دوسرے

رہتے ہیں۔ چولہا جلانے والے ہاتھوں کو اور بہتر سے کام دھندے ہیں۔ ماں کی ہر وقت سفر کے لیے ٹکٹ کٹی رہتی ہے بیٹی کے بازاروں کے چکر ختم نہیں ہوتے۔ بوڑھی دادی بھوکی پڑی ہے صبح کی ہے کوئی روٹی پوچھنے والا۔“

اس نے دہائی دی۔ اتنے میں دروازہ دھڑ سے کھلا اور سمیرا اور بلی آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئیں۔ یونیفارم کی نیلی گیس، سفید شلواریں دھول مٹی سے الٹی تھیں۔ بھاری اسکول بیگ کمر پہ لادے ہوئے وہ ایک ہاتھ میں بھڑ اور دوسرے میں گولیاں، ٹافیاں داہے ہوئے تھیں۔ جتنی صبح اسکول کے لیے نکلتیں اس وقت کوئی بھی ناشتہ بنانے پر تیار نہ ہوتا۔ نہ ذکیہ نہ ہی حمیرا اس لیے ان دونوں کو اچھا خاصا جب خرچ ملتا تھا۔ اسکول میں چاٹ، نان بنے یا سمو سے کھانے کے علاوہ چھٹی کے بعد بھی وہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی چیز ساتھ لے آتیں۔ سمیرا بارہ سال کی تھی، چھٹی میں پڑھتی تھی اور سب سے چھوٹی بلی تیسری جماعت میں تھی اور نو سال کی تھی۔

”امی۔۔۔؟“ دادی کو مارے باندھے سلام کرنے کے بعد اس نے برآمدے میں جھانکا۔

”تیری امی آگے کبھی گھر ہوئی ہے جو آج ہوگی۔“ دادی نے جملے کئے انداز میں کہا۔

”دادی۔۔۔ بھوک۔۔۔“ بلی جو دادی کے پہلو سے چپک کے بیٹھی تھی منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”تو تو ہے ہی بھوکی۔۔۔ ناپکوڑے بھی کھائے نمک مرچ والے امرو بھی۔ ابھی بھڑ لے کر دیا ہے۔“

سمیرا نے زمین پر بیگ پھینک دیا اور دونوں پیر آپس میں رگڑ کے جوتے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔

”کیا پکا ہے دادی؟“ بلی نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کلیجہ پکا ہے میرا۔“ دادی نے اسے برے ہٹایا۔ بھوک میں لاد بھی اٹھنے نہ لگ رہے تھے۔

”پکانے کے لیے پکانے والی کا ہونا ضروری ہے۔ اور نہ تیری ماں کا کلو اٹھتا ہے گھر میں نہ بسن کا۔ پکانا

کس نے ہے؟“

”تو دادی تم تو گھر پہ ہو۔ تم پکالو یا اس عمر میں آگے پکانا بھی بھول گئی ہو۔“

سمیرا اپنی بڑی بسن اور بھائی کی طرح منہ پھٹ اور بد تمیز تھی اس لیے تنک کے بولی۔

”مر۔۔۔ بے دہائی۔۔۔“ دادی بلبلا اٹھی۔

”مجھے نہ نظر صحیح طرح آتا ہے نہ بڑھی ہڈیاں گھسیٹ کے چلا جاتا ہے۔ اب میں اس عمر میں کھوتے جتنی جوان لڑکیوں کو پرانے پکا کے دوں۔“

”نہ سہی پرانے سوکھی روٹی ہی پکا دو۔“ دادی کو پتا کے اسے برا مزہ آتا تھا۔

”اور ویسے بھی ابھی کل خالہ ثریا کو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری اتنی عمر نہیں جتنی عام طور پر نانیوں دادیوں کی ہوتی ہے۔“

”تو بڑی کن سوئیاں لیتی ہے میری ماں کی چچی۔“ دادی نے چپل اٹھائی۔ ”ہاں نہیں ہے میری عمر۔۔۔ مگر

حال اپنے سے بڑھی عورتوں سے برا ہے۔ تیری ”چچی“ (گھر) ماں نے مجھے یخنیاں بنا بنا کے نہیں پلائیں۔ جتنی تیری زبان چلتی ہے اتنے ہی ہاتھ

پیر بلا لے۔ تو کیوں نہیں پکا لیتی۔ تیری عمر کی لڑکیاں ساری ہانڈی روٹی کرتی ہیں۔“

”کرتی ہوں گی۔ ساری لڑکیوں کے لبا کویت نہیں ہوتے۔“ وہ اترائی۔ ذکیہ نے بچوں کے دماغ میں اچھی طرح یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ اس محلے کے باقی لوگوں سے الگ ہیں۔ وہ تو گھر میں کوئی جوان مرد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے شوہر نے یہ ناکید کی ہوئی تھی کہ وہ

اس پرانے محلے کو نہ چھوڑیں، جہاں پرانی جان پہچان ہے۔ ورنہ وہ گھر میں معقول پیسے بھجوانے کے علاوہ بینک میں بھی برابر رقم جمع کراتا رہتا تھا۔ ماکہ وطن

واپس لوٹنے پر اچھا سا مکان کسی بڑے شہر میں لے سکے اور نیا کاروبار بھی شروع کر سکے۔ اس کے بچوں نے ابھی سے خود کو یورپ والہ کا سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔

”روٹی پکا تی ہے میری جوتی۔ بلی! جا بشیرے کے ہوٹل سے دو پیسے والے نان پکڑا۔ کتنا امی شام کو پیسے

دے دے گی۔

”نا مارو، بے دید۔ داوی یاد نہیں؟ اس کے ساتھ پیٹ نہیں لگا ہوا؟“

”چلو، داوی! کیا یاد کرو گی۔ ایک نان تمہارا بھی منگوا لیتے ہیں۔“

”تو کون سا احسان کر رہی ہے۔ جو ایسے جتنا رہی ہے تیری تو پھینٹی لگانی پڑے گی اب گھڑی گھڑی میرے منہ کو آتی ہے۔“

”چل اٹھ نا، قیے والے نان کا سن کر اب مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔“ سمیرا نے بلی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

”میں نے نہیں جانا۔ میں تھکی ہوئی ہوں۔ بشیرے کے ہوٹل پہ رش بھی بڑا ہوتا ہے۔ اتنی دیر سے باری آتی ہے۔“

”اسے رہنے دے سمیرا! اس وقت ہوٹل پہ جولفنگا ہوتا ہے وہ جمع ہوتا ہے۔ فرخ سے کہہ وہ لادے۔“

”لو، داوی کی بات سنو۔“ سمیرا نے کھینچ کھانچ کے آخر بلی کو کھڑا کر دیا۔

”فرخ بھائی تو امی کے کہنے پہ کبھی نیچے نہ اتریں۔ میری بات کیا مانتی ہے اس نے۔ چل بلی جلدی کر۔“

بلی چھوٹی ہونے کی وجہ سے بھی سب سے دہتی تھی۔ اور کچھ فطرتاً بھی دلو تھی۔ دل نہ چاہنے کے باوجود کھڑی ہو گئی۔ اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے داوی کی چیمٹی بھی تھی۔ اب بھی داوی کو اس پہ ترس آنے لگا۔

”لو، ذرا سی بچی گرمی میں پیدل چل کر اسکول سے گھر آئی ہے اور ماں کا سکھ نصیبوں میں ہے نہ کئی پکائی روٹی۔ اب پھر گلی گلی پھرے گی۔ پیٹ بھرنے کے لیے۔“ وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ بلی دس پندرہ منٹ بعد اخبار میں لٹے گرم گرم قیے والے نان لے بھی آئی۔ سمیرا نے پٹیس لانے کی زحمت کیے بغیر اخبار میں سے ہی نونج نونج کر کھانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ داوی نے سراکھایا۔

”لو آئی تمہاری مسافر ماں، اسے بھی خوشبو آگئی

ہو گی قیے والے نان کی۔ سہیل بھی تو بھوکے منگے خاندانوں کی ہٹائی ہیں۔ النان کے لیے خوراکیں خرید کے لے جاتی ہے۔ آگ لگادی ہے مرد کے پیسوں کو۔“

داوی اس وقت اپنے منہ سے دونوں کام برق رفتاری سے لے رہی تھی۔ کھانے کا بھی۔ اور طعنے دینے کا بھی۔ ذکیہ کے لیے شاید یہ معمول کی بات تھی۔ اس نے ساس کی باتوں کا جواب دینا تو درکنار ان پہ برا ماننے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ چادر اتار کے چارپائی پہ بھینٹنے کے بعد وہیں بیٹھ کے ہانپنے لگی۔ اس نے ناگوار سے زمین پہ کمری گندگی برتنوں اور بستروں کو دیکھا ضرور تھا، مگر ان کے بارے میں کسی سے باز پرس کرنا ضروری نہ سمجھتا تھا۔

”پیدل چل کے آرہی ہے مانگے منڈی سے؟“

داوی پھر طنز پہ بولی۔

”اچھی بھلی سویرے گھر سے نکلی تھی۔ وہاں جاتے ہی پیٹ میں درد اور موٹس۔ توبہ، برا حال ہے۔“ وہ وہیں دراز ہو گئی اور چادر کے پلو سے بندھا ہوا ہونہ نکالا۔

”بلی! جانکر کے کھوکھے سے سوڈے کی بوتل لے آ۔“

”امی، میں نے نہیں جانا۔“ اس نے ٹھنک کے کہا۔

”میں ابھی ابھی باہر سے نان لے کے آئی ہوں۔ میرے سے نہیں جایا جاتا بار بار۔“

”نان تو تیرے باپ نے دس دس نوکر رکھ کے دیئے ہوئے ہیں مجھے۔“ پیٹ کے درد سے وہ پہلے ہی بے حال تھی۔ بلی کے انکار نے اسے تنگ کر دیا۔

”وہ دس کیا بارہ نوکر بھی رکھ دے تب بھی اس گھر کا کچھ نہیں ہونے والا۔“ پیٹ پوجا کے بعد داوی میں اور دم خم آگیا تھا۔ ”نوکروں پہ راج کرنے والیوں کے بھی کوئی گن ہوتے ہیں۔“

”ماں! میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں۔“ ذکیہ کتنی ہی ست اور لاپرواہو۔ ساس سے بدکلامی سے پرہیز کیا کرتی۔

”بھی کیا کرے“ ماں جو کرے گی اس نے وہی دیکھنا ہے اور وہی سیکھنا ہے۔“

”اچھا اماں! بس کرو۔ ماں لیا میں نے۔ میں بڑی نکمی ہوں۔ اب بس کرو۔“ پیٹ کے ساتھ ساتھ اب سر میں بھی دروہ ہونے لگا تھا۔

”نکمی کھی تو نہیں“ اب ہو گئی ہے۔“ داوی کا ولیم اچانک کم ہوا۔ اسے شاید شادی کے ابتدائی سالوں والی ذکیہ یاد آگئی تھی۔ تب وہ خاصی سکھڑ ہوا کرتی تھی۔ اب غالباً شوہر کی غیر موجودگی اور روپے پیسے کی فراوانی نے لا پرواہ کر دیا تھا۔

”اب بھی وقت ہے“ عقل کر، پیسے کا کیا ہے آنی جانی چیز ہے۔ آج ہے تو فائدہ اٹھا۔ جوڑے رکھ۔ کھانے پینے، تحفے دینے اور کپڑے لیرے بنانے میں ضائع نہ کر۔ یہ گھر دیکھ، اس محلے کے پانی گھروں سے الگ نظر نہیں آتا۔ وافر کمائی کا کوئی اثر گھر پر نظر نہیں آتا۔ گھر میں گھر والی کا دل لگے تو اس کو گھر بنانے، سجانے کا شوق بھی ہو۔ یہ تو شکر کر، بانو بے شک تیری نند ہے، لیکن پھر بھی مندپنا نہیں دکھایا۔ نہ تیری لا روایاں دیکھیں نہ تیری بی بی کے سیر سپائے اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے مانگ لیا حمیرا کو۔“

”بڑا احسان ہے اماں! مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔“ ضبط کرتے کرتے بھی ذکیہ کی آواز بھرا گئی۔ بلی سے دیکھنا نہ گیا۔ یہ بحث اس کے باہر جانے سے انکار ہی شروع ہوئی تھی۔ اسی لیے اس نے اس بحث کو ختم کرنے کا سوچا۔

”لاؤ امی! پیسے دو میں بوتل لا دوں۔“ اسے دروازے سے نکلتا دیکھ کے داوی ایک بار پھر بڑبڑائے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں“ اب اسے بھی رستہ دکھاؤ باہر نکال۔ کوئی کسر نہ رہے۔“



روم صحن کے ہر انداز سے عجلت جھلک رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا وہ کہیں جانے کے ارادے سے

”چل شاباش بلی! جلدی کر۔ بہت دروہ ہے۔“

”میں نکمی ہوئی ہوں سمیرا سے کہو۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس نے ٹھیکہ لے رکھا ہے صبح شام چکر لگانے کا۔“ داوی نے اپنی لاڈلی پوتی کی سائیڈ لی۔

”اماں! سمیرا اب سیانی ہو گئی ہے۔ اس لیے اسے دکانوں پر نہیں بھیجتی۔“

”تو چلی کے سیانے ہونے میں کتنا وقت ہے۔ اور وہ جو سب سے بڑی ہے، جوان جہان۔ اسے ٹین گھنٹے ہو رہے ہیں گھر سے نکلے ہوئے۔ کچھ اس کی بھی پروا ہے یا نہیں۔“

”دیناں ساتھ ہی ہوگی، گھر میں جو کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں اس سے ہی پتہ چل گیا تھا اس لیے فکر نہیں ہوئی۔“

”ہاں دیناں تو جیسے بڑی اعتبار والی بندی ہے نا، جس کے ساتھ لڑکی کو بھیج کر ختمے فکر ہی نہیں ہو رہی۔ وہ گھر گھر جھانڈو بونچھا کرنے والی ذات۔ اس کا کوئی بھروسہ ہے بھلا، مجھے تو حمیرا کا اس کے ساتھ لور لور پھرنا پسند نہیں، بھائی کس لیے ہوتے ہیں۔ اچھے گھروں کی لڑکیاں باپ بھائی کے ساتھ باہر جاتی اچھی لگتی ہیں۔ اب اپنی بوتل کے لیے آواز دے نا اسے۔ جو ہنہوے سے لگا رہتا ہے چھتیس گھنٹے۔“

”اے اماں! نہیں منگانی مجھے بوتل۔“ ذکیہ نے ہاتھ جوڑے۔

”یہ کہہ کہ اپنے شہزادے کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ مانا کہ اکلوتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے لاڈ میں برباد کر کے رکھ دیا جائے۔ میرا بھی اکلوتا بیٹا ہے۔ پیار بھی کیا مجھ بیوہ عورت نے اور باپ کی طرح رعب بھی رکھا۔ ہڈ حرام نہیں بنایا ورنہ آج پردیس میں دسائیاں نہ لگا رہا ہوتا۔ یہیں سبھی توڑ رہا ہوتا تیرے بیٹے کی طرح۔ پھر میں دیکھتی رہی عیش و آرام کہاں سے آتے لڑکی ہے تو اس کا ناس مار ڈالا ہے تو نہ بچائے گھر واری سکھانے کے اسے بازاروں اور سیلیوں کے گھروں کا رستہ دکھا دیا ہے وہ

جلدی جلدی کام نمٹا رہی ہے۔

”اوہ لیس۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ”ایک تو یہ گاڑی ہمیشہ ان دنوں دغا دے جاتی ہے، جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مئی کالی بی ایک دم شوٹ کر گیا ہے۔ اور ڈاکٹر نے کہا تھا ایسی حالت میں ان پر فالج کے دوسرے انیک کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بہت کثیر کی ضرورت ہے۔ اب پتہ نہیں مگنی دیر ان کی طبیعت خراب رہے۔ میں تو ان کالی بی ہالی ہونے پہ فوراً اسپتال لے جاتی ہوں، فوری ٹریٹ منٹ کی وجہ سے پیرالائز ہونے کا خطرہ مل جاتا ہے، اگر رات کو خوانخواست۔“

تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بولے جاری تھی۔

”تم اتنا آگے تک کامت سوچا کرو۔ اور اگر سوچنا ہی پڑے تو کم از کم اچھا سوچو۔ ایسا کرو تم آج میری گاڑی رکھ لینا۔ میری طرح قابل اعتبار ہے۔“

”تمہیں پریشانی ہوگی۔“

”اگر رکھنا کہہ رہی ہو تو لعنت ہے تمہاری سوچ پہ۔ اور واقعتاً میری پریشانی کا خیال ہے تو ڈونٹ وری۔ میں تمہاری طرح ان چار پیسوں پہ مکمل انحصار نہیں کرتا۔ میری بائیک کس دن کام آئے گی۔ اور کل تو یوں بھی آفڈے ہے۔“

رومیہ ایک بار پھر گھر کا نمبر ملا کے سنیعہ سے بات کر رہی تھی۔ ”اوکے یہ اچھا ہے، تم پہنچو۔ میں آ رہی ہوں۔ ہاں حق نواز بھی ساتھ ہے۔ پریشان مت ہونا۔ تمہارے ہاتھ پیر پھولیں گے تو خمی کی طبیعت اور بگڑے گی۔ ان کی ساری فالٹز ساتھ رکھ لینا۔“

”رائٹ سے ٹرن لے لینا، ہم گھر نہیں، اسپتال جا رہے ہیں۔“ اس نے سیل فون آف کرتے ہوئے کہا۔

”سامنے والی آئی صفورا اپنی کار میں مئی اور سفینہ کو اسپتال لے جا رہی ہیں۔ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”یہ بات تمہیں اپنے آپ کو بتانا چاہیے، مجھے

حق نواز نے کچھ دیر تک اسے برق رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے، سی ڈیزدراز میں رکھ کے لاک کرتے اور فالٹز کیبٹ میں رکھتے دیکھا۔ اب وہ اپنا سیل فون، اور چابیاں وغیرہ اٹھا کے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ اس دوران بوکھلاہٹ میں کئی سی ڈیزدراز ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گری تھیں۔ جنہیں سمیٹتے ہوئے اس کے سارے چہرے پہ جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ فالٹز رکھتے ہوئے بھی اس نے اپنی عادت کے مطابق ترتیب کا کوئی دھیان نہیں رکھا تھا۔ بلکہ الٹی سیدھی ڈھیر کر دی تھیں۔ حق نواز کے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ اس وقت فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا اور کن اکھیوں سے گاہے بگاہے اس کی غجالت اور گھبراہٹ بھی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی رومیہ نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا، حق نواز نے دوسری جانب سے بات کرنے والے کو بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر ہی جلدی سے ”اللہ حافظ“ کہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”خیریت رومیہ؟ کس کا فون تھا؟“

وہ یہ تو نوٹ کر ہی چکا تھا کہ اچھی بھلی انہماک سے کام کرتی ہوئی وہ اچانک آنے والی ایک فون کال سے ڈسٹرب ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی اس نے انفرادی میں اپنا کام سمیٹا تھا۔

”گھر سے تھا، سنیعہ کا۔“ وہ جواب دے کر تیزی سے مڑی اور پھر کچھ یاد آنے پہ پلٹی۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نمودار ہو گئی۔

”سر سے تو بات کی ہی نہیں۔ اور وہ ابھی میٹنگ میں بڑی ہیں۔ حق نواز! تم میرے لیے ایک فیور کرو گے۔ پکیز سر منظور سے کہہ دینا کہ میں گھر جا رہی ہوں۔ مئی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔“ حق نواز نے ایک دم ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم شاید بھول رہی ہو کہ تمہاری کھٹار اور کشاپ

نہیں، کبھی سنیچر کو پریشان نہ ہونے کی تاکید کر رہی ہو، کبھی مجھے فکر نہ کرنے کا کہہ رہی ہو۔ جب کہ ہوائیاں تمہارے اپنے چہرے پر اڑ رہی ہیں۔“
”کیا کروں۔“ اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ آواز میں بھی آنسوؤں کی نمی کھل گئی تھی۔

”چار سال پہلے جب اس میں فالج کا پہلا اٹیک ہوا تھا تب بہت مشکل وقت گزارا تھا۔ میرے فاسٹل ایگزامز ہو رہے تھے۔ سنیچر بہت چھوٹی تھی ابھی نائنٹھ اسٹینڈرڈ میں پڑھتی تھی۔ میں اکیلی می کو سنبھالنے کے قابل نہ تھی اس کے باوجود مجھے اس میں اس چودہ سالہ بچی کے بھروسے پہ چھوڑ کے نکلنا پڑتا تھا۔ بہت کٹھن دور تھا۔ ایک تو علی کے اچانک غائب ہونے کا صدمہ۔ فنانشل کرائس۔ اور پھر می کا پیرالائز ہونا۔ کبھی تو دل چاہتا تھا سب چھوڑ چھاڑ کے گھر بیٹھ جاؤں۔ اس اتنی سی بچی کے لیے تقریباً ناممکن ہوتا تھا می کی دیکھ بھال کرنا۔ لیکن میں ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ پیانے چھوڑا تھا وہ می کی بیماری اور قرضے چکانے میں ختم ہو گیا۔ می کی جاب بھی نہ رہی۔ اب اگر میں بھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاتی تو جیسے تیسے پیپر زدے۔ رزلٹ کے بعد جاب کی تلاش۔ شکر ہے زیادہ خوار نہ ہونا پڑا۔ لیکن نئی نئی جاب اور وہ بھی ایسی فف اس کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریاں اور می کی دیکھ بھال۔ ان کو اسپتال وزٹ کے لیے اور فزبو تھراپی کے لیے لے جانا یہ سب مجھے مشین بنا گیا۔“

”تمہاری محبت رنگ بھی تولائی۔ آنٹی پیرالائز ہونے کے ڈیڑھ دو سال بعد بھی اپنے پیروں پہ چلنے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے قابل تو ہو گئیں، ٹھیک ہے کہ ان کا دایاں بازو اور ٹانگ برابر موو نہیں کرتے مگر اب انہیں کم از کم کسی ڈیپنڈنٹ تو نہیں ہونا پڑتا۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ فالج کے شکار بعض اوقات ایسے خوش قسمت ثابت نہیں ہوا کرتے۔“
”اس بات کا تو میں بھی شکر ادا کرتی ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ مشکل دن یاد آتے ہیں تو غور غور بھی ہو جاتی

ہوں۔ ان کا بی بی ذرا سا بھی ہلکی ہو جائے تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے۔ فالج کا دوسرا اٹیک زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔“

”ہاں فکر تو ہوتی ہے، میری امی بھی ہلکی بلڈ پریشری مریضہ ہیں، لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پریزی کی قائل نہیں۔ نہیں آنٹی بھی تو بد پریزی نہیں کرتیں؟“
”نہیں، ایک تو انہیں ویسے بھی کھانے پینے سے خاص دلچسپی نہیں۔ ضروری خوراک بھی بہت اصرار کے ساتھ کھانا پڑتی ہے۔ دوسرا سنیچر خاص دھیان رکھتی ہے کہ کھانے میں نمک، مسالے اور آئل زیادہ نہ ہونے پائے۔ یہ اس کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ لیکن صرف ڈائٹ کنٹرول کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زیادہ ٹینشن لینے سے بھی تو منع کرتے ہیں۔“

اس بار حق نواز کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ انہیں ٹینشن سے دور رکھا کرو۔ کیسے کہتا جب کہ وہ جانتا تھا۔ جس ماں نے اپنے دس سال کے خوبصورت صحت مند ذہین بچے کو کھودیا ہو اسے قرار کہاں؟
اس نے اسی خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔



رومیہ شاد کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور متمول گھرانے سے تھا۔ اس کے پیلا ایک کامیاب سرجن تھے، تو می ایک ہائی کوالٹی پروفیسر، تین بہن بھائیوں میں رومیہ کا نمبر پہلا تھا۔ اس سے سات سال چھوٹی سنیچر تھی اور سب سے چھوٹا علی، ان کا اکلوتا اور پیارا سا بھائی۔ یہی ان کی چھوٹی سی فیملی تھی اور اسے زیادہ چھوٹی اس لیے لگا کرتی کہ پیلا اور می دونوں بے انتہا مصروف لوگ تھے۔ گھر اور بچوں کے لیے چاہنے کے باوجود وقت کم ہی نکال پاتے وہ اور سنیچر تو پھر خوش قسمت تھے کہ ان کا سارا بچپن دادا اور دادی کی رشفقت تربیت میں گزرا۔ ڈاکٹر شاد اور مسز نیلو فر شاد بچپن کو اطمینان سے دادا دادی کے سپرد کر کے اپنے فرائض نبھاتے، اگرچہ دیکھ بھال کے لیے گورنس بھی

موجود تھی۔ مگر ڈاکٹر ثار کی والدہ پرانے خیالات کی مالک تھیں۔ انہیں بچوں کا ملازموں کے رحم و کرم پہ چھوڑنا پسند نہ تھا۔ جہاں تک ان سے ممکن ہو تا وہ بچوں کے سب کام اپنی نگرانی میں کروائیں۔ حتیٰ کہ ان کے ٹیوٹر اور قاری صاحب کے آنے پر بھی ان کے ساتھ موجود ہوتیں۔ ان کی نگہداشت پہ ہی بھروسہ کر کے مسز نیلو فرٹار نے دو بچیوں کے بعد ایک بیٹی کی خواہش پہ تیسری بار ماں بننے کا حوصلہ کر لیا۔

لیکن علی کے آنے کے بعد دادا، دادی دونوں نے دنیا سے جانے میں زیادہ وقت نہ لگایا۔ علی ڈھائی سال کی عمر میں گورنس کے سپرد کر دیا گیا۔ مسز ثار کی تدریسی ذمہ داریاں مزید بڑھ چکی تھیں۔ اب وہ ایک بڑے تعلیمی ادارے کی وائس پرنسپل تھیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی میں ان کی لیکچرر شپ بھی جاری تھی۔ دوسری جانب ڈاکٹر ثار اپنے برسوں پرانے خواب کی تکمیل میں مگن تھے۔ اپنی سالوں کی محنت سے کمائی جانے والی دولت کے ساتھ ساتھ خاندانی جائیداد تک لگا کر وہ ایک بڑا اور جدید اسپتال بنانا چاہ رہے تھے۔ لہذا جو وقت ملتا بھی تو وہ اسی میں صرف ہو جاتا۔ رومیسہ اور منیہہ اپنی پڑھائی میں مصروف تھیں، کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کی جانب سے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود علی سب کا چیمٹا اور لاڈلا تھا۔ علی شروع سے ہی بے انتہا ذہین تھا۔ اسے بہترین اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے لیے دنیا کی ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی۔

ابھی وہ پانچ سال کا تھا کہ ڈاکٹر ثار دل کے پہلے دورے میں ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت جب ان کا خواب تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ یہ سانحہ پوری فیملی کے لیے کئی لحاظ سے ناقابل برداشت تھا۔ ایک تو بچے اس عمر میں باپ کے سایے سے محروم ہو گئے، جب انہیں اس کی اشد ضرورت تھی اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر ثار جاتے جاتے اپنے پیچھے لاکھوں کا قرضہ چھوڑ گئے۔ جو مسز نیلو فرٹار کو یہ بنگلہ، چند پلاٹ جو

بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے لے کر رکھے گئے تھے۔ اپنے جینز میں ملنے والا فلیٹ اور قیمتی زیورات تک بیچ کر ادا کرنا پڑا۔ پوش علاقے سے وہ ایک نسبتاً متوسط علاقے کے معقول فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ گورنس ملک، ڈرائیور۔ سب کو قاری کرنا پڑا۔ اگرچہ مسز نیلو فرٹار کی اپنی آمدنی خاصی تھی۔ لیکن وہ نہ تو بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی کھدو ماتر کرنے پہ تیار تھیں نہ ہی ان کے طرز زندگی میں نمایاں فرق لانے انہیں احساس محرومی اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے بچے اب بھی ان ہی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ جن کی فیس ادا کرنے میں ان کی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ نکل جاتا۔ ایک جزوقتی ملازمہ بھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ چونکہ دن کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتیں اس لیے بلڈنگ کے گیٹ کیپر کو تنخواہ سے زائد رقم دیتیں تاکہ وہ ان کی غیر موجودگی میں فلیٹ کا دھیان رکھے۔

ابتدا میں انہیں خاصی مشکل پیش آئی۔ عملی زندگی میں وہ عرصے سے تھیں۔ پہلے بھی جاب اور گھر کی ذمہ داریاں دونوں ہی اٹھا رکھی تھیں، لیکن تب ذمہ داریاں بانٹنے والا بھی موجود تھا۔ اور وہ یہ کام اپنے شوق اور لگن سے کرتی تھیں۔ اب مجبوراً محنت کرنا پڑ رہی تھی تاکہ گھر اور بچوں کے خرچے چلتے رہیں۔ اب جسمانی تھکان کے ساتھ ساتھ اعصابی اور ذہنی تھکان بھی رہنے لگی تھی۔ ابھی سب سے بڑی بیٹی رومیسہ بھی سولہ سترہ سال کی تھی اس کے باوجود وہ خود کو بہت عمر رسیدہ محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ جو ہمیشہ بہت تروتازہ اور ہشاش بشاش رہا کرتیں اب پڑھرہ اور تڑھال نظر آنے لگیں۔

رومیسہ عمر کے لحاظ سے سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی تو منیہہ فطرتاً راضی بہ رضا رہنے والی۔ بچوں نے باپ کی کمی کو محسوس تو کیا لیکن حالات کی تبدیلی کو قبول بھی کر لیا۔ جب کہ نازو نعم اور آسائشات میں ملنے والا علی چڑچڑا ہوا گیا۔ وہ اپنی گورنس کو بھی بہت مٹس کرتا تھا جس سے پچھلے ڈھائی تین سالوں میں وہ

خاصا اٹیج ہو چکا تھا۔ اسے یہ چھوٹا سافلیٹ بہت برا لگتا تھا وہ اپنے وسیع و عریض شنگے میں بنے لان میں سائیکل چلانا چاہتا تھا، فٹ بال کھیلنا چاہتا تھا، اس کی ضد کے ہاتھوں مسز نیلو فرٹار مجبوراً اسے بلڈنگ کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دے دی۔ رفتہ رفتہ بہل ہی گیا۔

مسز نیلو فر کو اس کے پریشانی میں دلچسپی نہ لینے پہ تشویش تو تھی لیکن وہ جانتی تھیں ابھی اسے اس ماحول سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ گیٹ کیپر الفت خان سے انہوں نے خاص طور پہ علی کا خیال رکھنے کو کہہ رکھا تھا ماکہ وہ بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے اور وہ بھی الفت خان سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔ ایک دو سال میں وہ سب بھول بھال گیا۔ یوں بھی اس کی عمر ہی کتنی تھی — وہ نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہو تو اس کی ذہانت بھی مزید بڑھ گئی۔ اپنی بڑی بہنوں کی طرح وہ بھی کلاس میں نمایاں پوزیشن لینے لگا حالانکہ کھیل میں اس کی دلچسپی برقرار تھی۔ اسٹڈیز کو واجباً سا وقت دینے کے باوجود وہ اچھے مارکس لے لیتا تھا اس لیے مسز نیلو فر اس کے باہر رہنے پہ زیادہ اعتراض نہیں کرتی تھیں۔ اور ویسے بھی وہ ان کے آنے سے پہلے پہلے گھر واپس ضرور آجاتا تھا لیکن ایک شام جب مسز نیلو فر فرٹار گھر لوٹیں تو رومی صمد کو پریشانی کے عالم میں بالکونی سے نیچے جھانکتے پایا۔

”مُمی! علی اب تک گھر نہیں آیا۔“

”اس کو اب ذرا کھینچ کے رکھنا ہی پڑے گا۔ فغفہ اسینڈرڈ میں آگیا ہے۔ ویسے تو ذہین ہے مگر لا پرواہی بہت ہے۔ اگر اب بھی اس نے اسٹڈیز کو سیریسلی نہیں لیا اور یونی اپنا نام ہو بسٹ کرتا رہا تو۔“

”مُمی! اس کے سارے فرینڈز واپس آچکے ہیں۔“ وہ اپنی گرم شال اتار کے تیرہ کرنے کے بعد اپنی سینڈل اتارتے ہوئے کہہ رہی تھیں جب رومی صمد نے ان کی بات کاٹتے ہوئے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔ ان کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے سوالیہ نظروں سے وہ بھی کی جانب دیکھنے لگیں۔

”میں نے آس پاس کے سب ہی فلیٹس میں پتہ کروالیا ہے۔“ اس کی بات سنتے ہی انہوں نے دوبارہ سینڈل پہنی اور شال اوڑھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے خود علی کے سب دوستوں کے گھروں میں جا کے پتہ کیا وہاں سے علم ہوا کہ سنی تو اپنی فیملی کے ساتھ یہ ویک اینڈ گزارنے اپنی مائیک کے ہاں گیا ہوا تھا۔ زویب قلمو ہونے کی وجہ سے نیچے ہی نہیں اترا جب کہ فیضی اور سرمد جو ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے، ان کے منتقلی ٹیسٹ ہو رہے تھے وہ بھی آج کھیلنے نہیں آئے۔ ان کے علاوہ دو اور دوست تھے ان دونوں کا کہنا تھا کہ اپنے باقی دوستوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ جلدی بور ہو کے واپس چلے گئے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ علی اور کتنی دیر تک نیچے رہا اور کیا کرتا رہا۔ الفت خان کے بیان کے مطابق اس نے آخری بار علی کو کپاؤنڈ کے اندر ہی سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔ جب وہ عصر کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو کپاؤنڈ خالی تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ علی بھی اوپر چلا گیا ہو گا۔

مسز نیلو فر کے ساتھ آس پڑوس کے کئی لوگوں نے ہر ممکنہ جگہ پر علی کی تلاش رات بھر جاری رکھی۔ اگلے دن پولیس میں رپورٹ بھی درج کرائی گئی لیکن علی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس وقت وہ دس برس کا تھا۔ اس کے جانے کے صرف ڈیڑھ مہینے بعد ہی مسز نیلو فر فرٹار قلع کے باعث معذور ہو گئیں۔ دو سال رومی صمد نے ان کی بیماری سے لڑتے گزارے۔ اب وہ اس قابل ضرور تھیں کہ چل پھر لیتی تھیں۔ دایاں بازو حرکت نہیں کرتا تھا۔ اور دائیں ٹانگ میں بھی ہلکی سی لنگر ڈاٹ آگئی تھی۔ اس کے باوجود اب وہ معذوری کی زندگی نہیں گزار رہی تھیں اور رومی صمد اسی پہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ البتہ بیٹے کے جدائی کے غم سے ماں کو نکالنے میں ناکام تھی جس نے پچھلے چار سال سے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔



حیرا کرے کے اندر تھی، لیکن باہر سے کئی ہوئی

”بلی۔۔۔ بلی۔۔۔“ ابھی پہلا وقفہ ہی آیا تھا کہ ذکیہ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

”جا“ بشرے کے تندور سے روٹیاں پکڑا اور صلیق کی دکان سے پاؤ بیسن اور انڈے بھی لاوے۔ اب آصف اتنے دنوں بعد آیا ہے تو روٹی کھائے بغیر تو نہ جانے دوں گی۔ شور بے والے کوفتے ہیں بغیر ایلے انڈوں کے مزا نہیں آئے گا اور آصف میرے ہاتھ کے پکوٹوں کی بھی فرمائش کر رہا ہے، چل جلدی سے دوڑ لگا۔

”ای۔۔۔ عینک والا جن“ اس نے ہائی دی۔
 ”آگ لگے تیرے عینک والے جن کو کھر میں ہونے والا جوائی بیٹھا ہے“ اسے بہانے پڑے ہوئے ہیں۔ اٹھ جا میں کہہ رہی ہوں۔
 ”ذکیہ! فرخ کو بھیج دے۔ کم از کم شام کے وقت تو لڑکی کو نہ بھیجا کر۔“ داوی نے بھی اندر ہی سے آواز دی۔

”فرخ کبھی اس وقت گھر ہوا ہے اماں؟ اور اپنا محلہ ہے۔“ ڈر کی کیا بات اتنی رونق ہوتی ہے باہر اب میں روٹی والوں یا دکانوں کے پھیرے لگاؤں۔ حمیرا تو آج باہر نکلنے والی نہیں۔ پتہ تو ہے کہ اتنی شرمیلی ہے۔
 ذکیہ کے اٹھتے ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑی حمیرا جلدی سے اندر ہو گئی۔ اس ساری بحث کے دوران آصف ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی خود دکان پہ جانے کی پیش کش نہیں کی۔ اور کیوں کرتا یہ صرف اس کے ماموں کا گھر نہیں تھا، ہونے والا سسرال تھا۔
 برے برے منہ بناتے ہوئے بلی ہاتھ میں پیسے دیا کے چلی ہی گئی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وقفے کے دوران وہ یہ کام کر لے تاکہ اس کا ڈرامہ نہ چھوٹ جائے۔

”چاچا بشرے۔ بارہ روٹیاں کڑک۔“ اس نے بچوں کے بل اچک کے تندور والے کو زور سے آواز دی۔
 ”چاچا! گھر مہمان آئے ہیں، مجھے پہلے لگاؤ۔ میں ابھی آگے لیتی ہوں۔“
 یہاں سے وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی صلیق کی دکان

پر گزرتی تھی کہ باہر آمدے میں ذکیہ کے سامنے بیٹھا اس کا منگیتر آصف نہ صرف اسے صاف نظر آ رہا تھا بلکہ وہ خود بھی اپنی بھرپور تیاریوں کی جھلک اسے دکھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ذکیہ کی پشت دروازے کی جانب تھی اس لیے وہ بیٹی کی سرگرمی سے لاعلم تھی اور نہ جانے کون سے خاندانی قصے چھیڑے بیٹھی تھی۔ جن کو بے دھیانی سے سنتے ہوئے آصف مسلسل سر ہلائے جا رہا تھا البتہ پھسلتی ہوئی بے باک نظریں بار بار حمیرا پہ جا پڑتی تھیں، بھولال سرخ کرپ کا جوڑا پنے، دوپٹے کا پلو جان بوجھ کے نیچے کرائے دروازے کے پٹ پہ اپنا سرخ نیل پالش سے سجا ہاتھ رکھے انگلیاں شرارت سے نچا رہی تھی۔ مسکارے اور آئی لائفو سے بوجھل پلکیں بھی ناز سے پٹ پٹاں جا رہی تھیں۔ ذکیہ گلاس رکھنے کے لیے نیچے جھکی تو آصف نے نظر بچا کے اسے ایک شوخ سا اشارہ بھی کیا جس سے اس نے شرم و حیا کا مظاہرہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اسی کمرے میں اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بیٹھی اپنا ہوم ورک بھی کر رہی تھیں۔

”باجی کو دکھنا ذرا۔۔۔ سری دیوی بنی ہوئی ہے۔“ سیرانے بلی کو ٹھوکا دے کر متوجہ کیا۔ اس کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بلی نے بھی اس منظر میں دلچسپی تلاشنا چاہی مگر اسے خاص مزہ نہ آیا۔
 ”کیا ہے؟“ وہ بار بار کے ٹھوکوں سے بد مزہ ہوئی۔
 ”دیکھ تو سہی! اپنے آپ کو ہیروئن سمجھ رہی ہے اور ہیرو دیکھ ذرا۔۔۔ منالا ہو رہی، زکوٹا جن۔“ وہ ہنسی دباتے ہوئے بولی۔ اگر یہ تبصرہ حمیرا کے کانوں تک پہنچ جاتا تو اس کی پھینٹی لگنا لازمی تھی۔

”زکوٹا جن۔۔۔ ہاں سچ۔۔۔ عینک والا جن کا ٹائم ہو گیا ہے، چلوٹی وی لگائیں۔“ بلی نے اس ڈرامے کا نام لیا جو آج کل اس کا پسندیدہ تھا۔

گوئی ماری وی کوئی یہ فلم جو گلی ہے سانسے۔“ پتہ نہیں ہے کیا مزہ آ رہا تھا جو اس کے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔ بلی اپنی کتابیں سمیٹ کر لی وی والے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں پہلے ہی داوی کا قہقہہ تھا۔

تک گئی۔
”صادق بھائی جان۔۔۔“ دکان یہ اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ اندر جھانک کے آواز دینے لگی۔ نیچے فرش پہ دری بچھائے لیٹا ایک لڑکا رسالہ پڑھ رہا تھا۔

”کیا چاہیے؟“ وہ اٹھ بیٹھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نو عمر لڑکا تھا۔ اس سے پہلے بلی نے اسے کبھی اس دکان یا محلے میں نہیں دیکھا تھا۔ یہاں یا تو صادق بھائی جان ہوتے یا ان کا چھوٹا بھائی راجا۔ کبھی کبھار ان کے بوڑھے ابا ہوتے۔

”پاؤ بیسن اور چھ اندھے۔“

اس نے سامنے رکھے اندھوں کے ریک میں سے چھ اندھے تو فوراً نکال کر ایک لفافے میں ڈالے اور مڑ کے زمین پہ رکھے ڈھیر سارے کنستروں پہ نظر ڈالنے لگا۔

”بیسن۔ ہال۔۔۔ یہ رہا۔“ اس نے ایک اور لفافے میں بیسن ڈالا۔ تھوڑا سا فرش پہ بھی گر گیا۔ پھر وہ اسے تولنے کے لیے ترازو میں رکھنے لگا تو اسے پاؤ وزن والا باٹ ہی کتنی دیر نہ ملا۔ ہر بات سے اناڑی پن جھلک رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔ پاؤ ہی ہو گا۔ اندازہ تو ہو رہا ہے۔ یہ لو بھی اور لاؤ پیسے۔“

”کیوں۔۔۔ میں تمہیں کیوں دوں پیسے؟“ بلی نے پیسوں والا ہاتھ پیچھے کیا۔

”یہ صادق بھائی جان کی دکان ہے ان کی چیزیں ہیں میں کسی اور کو پیسے کیوں دوں؟“

”ارے دام۔ تو سودا بھی پھر اپنے صادق بھائی جان سے لو۔ چلو مشکل گم کرو۔“ اس کے ڈانٹنے پہ وہ سسم کر چیخے ہٹی تو لڑکے کی ہنسی نکل گئی۔

”کوئے بدھو“ میں ادھر کھڑا ہوں تو دکان والوں کا کچھ لگتا ہی ہوں گا۔ صادق بھائی جان میرے کزن ہیں۔ وہ کسی کام سے گھر گئے ہیں۔ یہ سودا چاہیے تو پہلے جاؤ اور پیسے چپ چاپ ادھر رکھ جاؤ۔ اگر نہیں تو

شبائیں۔۔۔ مجھے رسالہ پڑھنا ہے۔“

اسے اگلی دکان پہ جا کے مزید وقت ضائع کرنے

کے خیال سے کوفت ہوئی۔ اس نے جلدی سے لفافے پکڑے، پیسے رکھے اور بھاگنے کی تیاری کی۔
”یہ لو۔“ اس نے ایک چوہو گم اس کی جانب بڑھائی۔
”یہ کیوں؟“ وہ ہچکچا گئی۔
”رکھ لو، میرے پہلے پہلے کسٹمر کے لیے یہ لوہاری بے بی۔“ اس نے زبردستی اسے چوہو گم تھمائی اور دوبارہ سے رسالہ کھول لیا۔

روٹیاں لے کر وہ گھر آئی تو ذکیہ کچن میں مصروف تھی۔ دادی ابھی تنک لی دی کے سامنے اور آصف وہیں جما بیٹھا تھا۔ کچن سے چونکہ لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا اس لیے حمیرا اب تاک جھانک نہیں کر رہی تھی۔

آصف بے زاری سے بیٹھا گردن ادھر ادھر گھما کے جائزہ لے رہا تھا۔

”اے بلی۔۔۔ ادھر آؤ۔“ آصف نے اشارہ کیا۔ کمرے سے آتی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ جلدی واپس لوٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اب دوسرا وقفہ آ رہا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے آصف کے قریب آئی۔

”اور سناؤ، کون سی کلاس میں پڑھتی ہو۔“ ایسی ہی دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے نظر بچا کے جیب سے ایک تہہ شدہ کانغہ نکالا اور اس کی مٹھی میں دبایا۔

”نی بابی کو دے وٹا۔“ سرگوشی کے انداز میں کہا گیا۔ ایک سنسنی سی بلی کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

یہ ڈیوٹی اسے بڑی دلچسپ محسوس ہوئی۔ وہ اس رقعے کو چھپا کے کمرے میں آئی تو حمیرا نظر نہ آئی البتہ سیرا کی جاسوس نظروں نے بھانپ لیا۔

”یہ ہاتھ میں کیا ہے؟“

”آصف بھائی جان نے دیا ہے، بابی کے لیے۔“

اس نے اسی رازدارانہ انداز کہا۔
”دکھاؤ۔“ اس کے نانا کرتے بھی سیرا نے رقعہ چھین لیا اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ چسکے لے لے

کے بڑھنے لگی، کہیں اس کا رنگ گلانی ہو جاتا اور کہیں سرخ۔ البتہ بلی کے سر کے اوپر سے یہ باتیں گزرتی رہیں۔ وہ جمائیاں لیتی رہی۔ اچانک ساتھ والے اسٹور سے حمیرا نکلی۔ سمیرا کے چھپاتے چھپاتے بھی اس نے رقعہ اچک لیا۔

”حرام خور! میرا خط بڑھتی ہے۔“ اس نے سمیرا کی کمر میں جڑنے کے لیے مکا اٹھایا ہی تھا کہ وہ غصہ دے کر باہر نکل گئی۔ بلی قابو آگئی۔ حمیرا نے اسے ہی دو تھپڑ دے مارے۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ رونے لگی۔ الٹا حمیرا کو مصیبت پڑ گئی کہ دادی یا ماں ادھر نہ آجائیں اس کی آواز سن کر اور اس کا خط پکڑا جائے جس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اس جمعے کو ملنے والے ہیں اور پہلے بھی ملتے رہے ہیں۔ یہ راز کھل جاتا تو اس کا گھر سے باہر نکلنا بند ہو جاتا۔ آصف سے تو کبھی مینے ڈیڑھ مینے بعد ملنا ہوتا تھا، لیکن روز کی سیر اور بازاروں میں خریداری۔ یہ سب بھی ختم ہو جاتا۔

”چپ کر پٹا خسی۔ چپ کر جا۔“
”حمیرا پڑھ رہی تھی۔ میں تولے کے آئی تھی آصف بھائی جان سے۔۔۔ امی۔۔۔“ حمیرا نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ جما دیا۔

”چپ۔۔۔ پہلے پھوٹا تھا کہ اس ذلیل سمیرا کی غلطی ہے۔ شاباش ادھر آ، میں کل تیرے لیے بازار سے اتنا پیارا میٹر بینڈ لائی تھی اور ہاں میرا ایک کام کرے گی تو کل اسکول کے لیے پورے دس روپے دوں گی۔“ اس نے ہسلا پھسلا کے اسے چپ کر رہی لیا اور ایک جوابی خط لکھ کے اسے تھمایا۔

”یہ جیکے سے ائے آصف بھائی جان کو دے دینا اور دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے اس سمیرا کی بچی کو بھی نہیں تو تو میری سہیلی ہے نا، کل میرے ساتھ زیتون کے گھر بھی چلنا۔ اس کی چھوٹی بہن سے تیری بھی دوستی ہے۔ وہ توں مل کے کھیلے گا، وہ میرا سا لڑکھا اور ہسلا دے دے کر اس نے بلی کو منالیا تھا۔

”آئی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”شکر ہے اللہ کا۔ پہلے سے خاصی بہتر ہے۔ اس روز تمہارے لیکچر کا خلاصہ اثر ہوا تھا۔ دودن سے بلڈ پریشر بھی نارمل ہے۔ اگر اسی طرح بے کار کی ٹینشن سے دور رہیں گی تو آئندہ بھی ٹھیک رہیں گی۔ جب تمہارے لیکچر کا اثر ختم ہونے والا ہو گا میں بتا دوں گی۔ اگر ایک ڈوز اور دے جاؤ۔“

اس کی نظریں مانیٹر پر جمی تھیں، ایک ہاتھ ماؤس کو متحرک رکھے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے بالوں کی اس موٹی سی لٹ کو بار بار کلن کے پیچھے اڑنے میں مصروف تھی، جو کلب کی قید سے نکل گئی تھی۔ ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ اس کے سوال کا تفصیلی جواب دے رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح حق نواز کو بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ اس نے حق نواز کی جانب دیکھتے ہوئے کوئی بات کی ہو۔ پتا نہیں وہ ایسا ارادہ کیا کرتی تھی یا غیر ارادی طور پر۔ مگر اسے رومیہ صمد کی ادا بہت بھائی تھی۔

”فنی الحال تو تمہیں آئی اور منیہہ کو آنا ہو گا ہمارے ہاں۔“

”وہ کیوں؟“
”بھول گئیں۔ شاہ نواز بھائی کی شادی یا پھر قاعدہ دعوت نامے کی منتظر تھیں۔ خیو۔ یہ میں لے آیا ہوں۔ تمہارا کارڈ۔۔۔“

اس نے ایک خوبصورت کارڈ اس کی جانب بڑھایا، جسے رومیہ صمد نے اپنا کام روک کے بغور پڑھا۔

”ویل۔۔۔ ولیمہ تو ہمارے گھر کے نزدیکی ہاں میں ہے۔

یعنی آسانی رہے گی۔ پہنچ جائیں گے بھی۔“
”کیا مطلب۔۔۔؟ صرف ولیمہ اٹینڈ کرو گی۔ مندی، اٹن حتی کہ کل ہونے والی ڈھولکی میں بھی تم انوائٹڈ ہو۔ خبردار جو کوئی گھپلا کیا تو۔“

”دیکھو، میں جھوٹے وعدے نہیں کر سکتی، اس لیے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ صرف ولیمہ پہ آؤں

گی اور میرے ساتھ می یا منہ ہوں گی یا نہیں اس کے بارے میں بھی ابھی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔“
”کیوں بہت مصروف ہستی ہو گئی ہو، پوچھوٹے موٹے لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہونا گوارا نہیں؟“

”پلیز حق نواز ایوں عورتوں کی طرح طعنے مت دیا کرو اچھے نہیں لگتے۔“ وہ ہنس پڑی۔
”کب اچھا لگتا ہوں یہ بتا دو تاکہ میں آئندہ اسی کیفیت اسی حالت میں رہا کروں۔“
”جب میرے کہے بنا میری بات سمجھ جاتے ہو تب۔“

”ابھی بھی میں کچھ کچھ سمجھ تو رہا ہوں مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“
”تم مجھے کام کرنے دو گے یا نہیں؟“
”ضرور کرنے دوں گا مگر یہ جاننے کے بعد کہ تم میرے ہاں آنے سے کتراتی کیوں ہو جبکہ فوزیہ کی شادی میں تم خوشی خوشی شریک ہوئی تھیں اور تب ہماری دوستی ایسی گہری بھی نہ تھی۔ دو تین ماہ ہوئے تھے جان پہچان کو۔“

”اور تب ہی میں جان گئی تھی حق نواز! کہ تمہاری فیملی مجھے پسند نہیں کرتی۔ نہ صرف میرے ساتھ بلکہ اس آفس کی وہ سب لڑکیاں جن کو تم نے کو لیگ ہونے کے ناتے اپنی بہن کی شادی میں انوائٹ کیا تھا۔ سب ہی کے ساتھ ان کا رویہ عجیب سا تھا۔ اس کے بعد ایک آدھ بار جب بھی میں ان سے ملی مجھے شدت سے یہ محسوس ہوا کہ انہیں مجھ سے ملنے سے تو کیا، میرے ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں شاید تمہارا مجھ سے زیادہ ملنا جلنا بھی پسند نہیں۔ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص پر اہم نہیں، نہ ہی میں اس میں اپنی انسلٹ محسوس کرتی ہوں۔ میں ایک پیچور لڑکی ہوں، جانتی ہوں ہر فیملی کی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ ان کے ذہن میں مگر باہر کام کرنے والی خواتین کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں تو یہ ایسی بات نہیں۔ میں اسے اپنا کام نہ بنا کے آنے

سے انکار نہیں کر رہی بلکہ میں اس خوشی کے موقع پر تمہاری امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی کیونکہ بات صرف اتنی نہیں کہ وہ مجھے ایک ورکنگ ویمن ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتی ہیں بلکہ شاید تمہارے حوالے سے بھی وہ کچھ خدشات رکھتی ہیں۔ ہاں ولیمہ یہ میں آجاؤں گی۔ ہماری دوستی کا بھرم بھی رہ جائے گا اور یہ فنکشن خاصا فارمل سا ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ آئنا سامنا نہیں ہو گا۔“ اس نے اتنی وضاحت سے یہ سب کہا کہ حق نواز کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

اس نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔ اس کی امی واقعی دقیا نوی خیالات کی تھیں اور سب سے بڑھ کے اس کا بڑا بھائی شاہ نواز۔ جس کی شادی تھی۔ اسی کی ضد کے نتیجے میں فوزیہ جو ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی، میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکی کیونکہ شاہ نواز کالج یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے کہنے پر فوزیہ کی شادی محض سترہ سال کی عمر میں کر دی گئی۔ حالانکہ امی پہلے بھولانا چاہتی تھیں اور شاہ نواز کی شادی کے لیے شرائط بہت سخت تھیں۔ اسے پردے کی پابند اور سیدھی سادی لڑکی چاہیے تھی۔ اب کہیں جا کے اس کی امی سویرا کو ڈھونڈ پائی تھیں جو تھی تو کالج سے گریجویٹ مگر پردے کی سخت پابند تھی۔ بہت کم گو اور معصوم شکل و صورت والی اس لڑکی کا چہرہ ہی اس کے باحیا ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ ایسے میں اگر حق نواز نے اشاروں کنایوں میں رومیمہ کے لیے اپنی پسندیدگی ظاہر کر دی تھی تو ان کا بھڑکنا فطری تھا۔ وہ دوسری بہو کے طور پر ایسی لڑکی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں جس کے سر پر باپ کا سایہ تھا نہ بھائی کا ساتھ۔ وہ یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی اور اب مردوں کے ساتھ اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بغیر پردے کے سارے شہر میں گاڑی دوڑانی، خبریں اکٹھی کرتی پھرتی تھی۔ رومیمہ ان کی ناگواری پہچان گئی تھی۔ ابھی تو وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ناگواری کی اصل وجہ حق نواز ہے۔ جس نے ماں کو

بے الفاظ میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ رومیہ کو زندگی کا سامنے کرنا چاہتا ہے۔

فوزیہ کی شادی یہ اس کے اور دو سری کو لیگز کے آنے سے شاہ نواز نے بھی ناک بھوں چڑھائی تھی۔

”ہن کی شادی ہے اور تم نے گرل فرینڈ کا ڈھیر اکٹھا کر لیا ہے۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے کہ کیسا آزاد گھرانہ ہے، ضرور لڑکی بھی۔“

”فار گاڈ سیک شاہ نواز! پتہ نہیں کیسے کیسے فضول خیالات آتے ہیں تمہارے ذہن میں۔“

اسے ان سب کو لیگز کا ”گرل فرینڈ“ ٹھہرائے جانا سخت برا محسوس ہوا جن سے اس کا خلوص اور احترام کا

رشتہ تھا بلکہ رومیہ اور اس جیسی کئی کو وہ بے حد سراہتا تھا جو اپنی فیملی کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔

رومیہ کی مثال سامنے تھی۔ وہ کم عمر تھی اور پرکشش بھی۔ اس کی طرح کتنے ہی لوگوں نے اس کی

ہم سفری کی تمنا کی ہوگی۔ وہ چاہتی تو کسی کا ہاتھ تھام کے ایک خوشحال اور بے فکر زندگی کی شروعات کر سکتی

تھی۔ مگر وہ ماں کے علاج، ہن کی اعلا تعلیم اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنے کے لیے ہی یہ جاب

کر رہی تھی۔ یہ نف جاب جو عام عورتوں کے بس کی بات نہیں پھر کیسے اسے یا کسی اور ایسی لڑکی کو برا قرار دیا

جاسکتا ہے جو گھر سے نکل کر باہر کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان میں اکا کا کا ایسی ہوں جو شوقیہ جاب

کرتی ہوں مگر ان چند کی وجہ سے سب کو ہی غلط نہیں کہا جاسکتا۔ کم از کم وہ تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف

اپنی کو لیگز کا ہی نہیں بلکہ روز بس اسٹاپ پر نظر آنے والی ہر اس لڑکی کا احترام کرتا تھا جو روزگار کی نیت سے

گھر سے باہر قدم نکالتی تھی۔ اس کے دل میں ان لڑکیوں کے لیے گھر میں بیٹھنے والی خواتین سے کہیں

بچہ کے احترام تھا۔ یہ بدکردار کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر ہوتیں تو ڈیڑھ دو

روزانہ کے لیے گلی محلوں کے پرائیویٹ اسکولوں میں چھ

چھ گھنٹے سرنہ کھاتیں۔ دسویں بارہویں منزل کی

ٹائیسٹ کی نوکری نہ کرتیں۔ آٹھ سو روپے کی خاطر

ریلوے اسٹیشن کے نزدیک بے کھوکھا نمائی سی او میں

ٹیلی فون آر میٹر کی سیٹ بیٹھ کے ہر قماش کے بندے

کو مسکرا مسکرا کے نہ جھیلیں اور نہ ہی سیلز گرل بن

کے گلی گلی پراؤٹ نیچے کی خاطر گھروں کے دروازے

کھٹکھٹاتیں اور بدلے میں خاتون خانہ کی بری بھلی

سنٹیں۔ اگر یہ واقعی بدکردار ہوتیں تو یہ سب کیوں

کرتیں۔ کیوں جان توڑ محنت اور ذلت والی زندگی

جیتیں۔ وہ بڑی آسانی سے غلط ذرائع سے اس سے

کہیں زیادہ رقم کما سکتی تھیں لیکن وہ ایسا نہیں

کرتیں۔ محنت اور حلال کی کمائی پر یقین رکھنے والی

ان محنت کش خواتین پر انگلی اٹھانا اسے پسند نہیں تھا

مگر یہ اس کے اپنے خیالات تھے، ان کو وہ نہ اپنے بھائی

پر ٹھونس سکتا تھا نہ ماں کو قائل کر سکتا تھا۔

”چلو اچھا ہے نہ آئے رومیہ! وہ خاصی سمجھ دار

ہے۔“ اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

”تم یقیناً فرخندہ لودھی کے کسی فیچر پر کام کر رہی

ہو۔“ اثبات میں جواب ملنے پر برا سامنے بنا کے رہ گیا۔

”ایک تو یہ محترمہ تمہارے حواسوں پر چھا گئی ہے۔

ذرا سوٹ نہیں کرتی تمہیں ایسی نعرے لگانی، نام نہاد

آزادی نسواں کی حامی سوشل ورکر ٹائپ خواتین سے

دوستی۔“

”پہلے تو میں یہ تصحیح کر دوں کہ وہ محض آزادی کے

بنیادی حقوق کے لیے کام کرتی ہے، خاص طور پر بچے

بچوں کو جس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے وہ۔“

”بس بس، رہنے دو۔ ہونہ۔ بچوں کو

نظر انداز۔“ اس نے مسخرانہ انداز میں سر جھٹکا۔

”میں نے کم از کم اپنے آس پاس بچوں کو نظر انداز

ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارے معاشرے میں تو بچوں کو

کچھ زیادہ ہی انڈر آبزرویشن رکھا جاتا ہے۔ ضرورت

سے زیادہ کیمرے ضرورت سے زیادہ لٹاؤ۔“

رومیہ نے گہری سانس بھری۔ ”تمہارا مشاہدہ

اس معاملے میں خاصا سطحی ہے۔ اس سلسلے میں پھر

کبھی تفصیلی گفتگو کریں گے۔ ابھی تو مجھے اس فیچر کے

فیچر چھاپنے سے یہ سب رک جائے گا؟“
 ”تم جو سیاست دانوں کے بچے اوجھڑتے ہو کیا ایسا
 کرنے سے وہ سدھر جائیں گے؟ نہیں۔ پھر بھی تم
 ایسا کرتے ہو، صرف عوام کو باشعور بنانے کے لیے تاکہ
 وہ اپنا برا بھلا سمجھ سکیں۔ یہ جان پائیں کہ کھوکھلے
 دعوے کرنے والے اور صحیح معنوں میں قوم کے لیے
 مخلص سیاست دانوں میں کیا فرق ہے۔ یہی مقصد
 فرخندہ کا بھی ہے، لیکن تم ٹھہرے سیاسی قسم کے
 صحافی۔ ایوان بالا کی ریشہ دوانیوں تک تو تمہاری نظر
 کی رسائی ہے مگر ایک عام شخص کی عام سی زندگی کے
 اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے
 دھیرے سے مسکرائی۔



”یہ کیسا کارڈ ہے؟“
 روہی نے گھر پہنچتے ہی اپنے بیگ سے شادی کا
 کارڈ نکال کر مسز نیلو فرٹار کو پکڑایا تو وہ پوچھنے لگیں۔
 ساتھ ہی دراز سے چشمہ بھی نکال لیا۔
 ”حق نواز کے بڑے بھائی کی شادی ہے، ساری فیملی
 کانوی میں ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔“ وہ سر ہلانے لگیں۔ ساتھ
 ساتھ کارڈ کا بھی بغور مطالعہ ہو رہا تھا۔

”مندھی تو آج ہی ہے۔۔۔ میری طبیعت تو ٹھیک
 نہیں۔ اگر سنبھلا تمہارے ساتھ جانا چاہے تو پوچھ لو
 اس سے۔“

”ہیں کہیں نہیں جارہی۔“ اس نے جوگرز
 اتارے اور کلمندی سے ان کے بیڈ پہ ہی آڑی
 ترچھی لیٹ گئی۔

”کیوں؟ میری فکر مت کرو، میں بالکل ٹھیک
 ہوں۔ تمہیں جانا چاہیے۔ حق نواز کو برا لگے گا۔ وہ ہر
 ضرورت کے وقت بن بلائے سب سے پہلے پہنچتا
 ہے۔“

”نہیں برا لگے گا، میں اسے بتا چکی ہوں۔ ویسے بھی
 میں نے صرف آج جانے سے انکار کیا ہے۔ مندی

لے بہت سارے سرچ ورک کرنا ہے۔ یہ ان بچوں کے
 بارے میں ہے جنہیں یتیم خانوں سے ایڈاپٹ کیا جاتا
 ہے۔ ان میں سے چند ایک ہی ایسے خوش قسمت
 ہوتے ہیں جنہیں ایک بھری پری تعلیمی کاسکھ مل پاتا
 ہے، ورنہ بڑے بڑی دعوؤں کے ساتھ گود لیے بچوں کا
 کیا حال ہوتا ہے، وہی فرخندہ لودھی نے دکھانا چاہا
 ہے۔ یتیم خانے والے بھی پلٹ کے نہیں پوچھتے۔
 میں فرخندہ کے ساتھ مل کے آج کل یہی ریسرچ
 کر رہی ہوں۔ اس کی این جی او نے کئی اہم یتیم خانوں
 سے پچھلے کچھ سالوں میں گود لیے جانے والے بچوں
 کے بارے میں معلوم کرایا ہے۔ افسوس کی بات ہے
 کہ ان درجنوں بچوں میں سے گنتی کے دو چار ہی
 اطمینان بخش حال میں ہیں۔ بے اولادی کی وجہ سے
 جن جوڑوں نے ان یتیم بچوں سے اپنی محرومی دور
 کرنا چاہی، ان میں سے کئی ایک کے اپنی اولاد ہو گئی اور
 انہیں اپنی یہ جلد بازی کھٹکنے لگی۔ جگر کا گوشہ بنا کے
 لے جانے والے وہ لوگ اب ان کو اپنے بچے اٹھانے
 اور کھلانے والا ملازم بنائے ہوئے ہیں۔ کئی خود تو ذہنی
 طور پر تیار ہو کے بچہ ایڈاپٹ کر بیٹھے مگر اپنی فیملی کو اعتماد
 میں نہ لے سکے۔ ایسا زیادہ تر جوائنٹ فیملی سسٹم میں
 رہنے والے جوڑوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کے گود
 لیے بچوں کو ماں باپ تو مل گئے لیکن داوا دادی، نانائانی،
 خالہ، پھوپھی بننے پر کوئی تیار نہیں۔ یہ بچے احساس
 کمتری کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایک فیملی میں پرورش پانے
 کے بعد ان میں جو اعتماد ہونا چاہیے تھا، ان کی ذہنی
 نشوونما جس طرح ہونی چاہیے تھی وہ مفقود ہے۔ صبح
 شام انہیں اس گھر میں رہنے والوں کی تحقیر کا سامنا کرنا
 پڑتا ہے اور بہت سے کہسز میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ
 بچہ گود لینے کی کوئی ٹھوس وجہ نہ ہونے کے باوجود ممتول
 خاندان ایسا کرتے ہیں اور عدلے میں لوگوں کی واہ واہ
 بھی مینے ہیں کہ وہ کسی یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے
 ہیں جس کے تعلق سے وہ کبھی ”مظالموں“ ”گورنمنٹوں“ کا
 ڈھیر لگا رہے ہوتے ہیں۔“

”یہاں فرخندہ لودھی کے سرچ ورک کے بارے میں اور تمہارے

دنیو کے فنکشن ایک تو بہت رات تک چلتے ہیں، دوسرے فضول کا شور شراب۔ اتنی تھکن کے بعد کہاں دل چاہتا ہے مئی؟

”لو کیاں تو ایسے فنکشنز میں جانے کے لیے ساری تھکن بھول جاتی ہیں۔ تم نے ہی کام اور بے ولی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ بیٹا! اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح رہا کرو۔ ضروری نہیں کہ جب کرنے والی لڑکی مشین ہی بن جائے۔ میں خود شادی سے پہلے سے پریکٹیکل لائف میں ہوں۔ اپنی خالہ کو دیکھو، بینک کی جاب کرتی ہے، مجھ سے دس سال ہی چھوٹی ہے لیکن اس ٹیپ ٹاپ سے رہتی ہے جیسے تم سے چار پانچ سال بڑی ہو۔ ایک تم ہو کہ اپنا خیال رکھتی ہو نہ اپنی ڈرائنگ کا۔ کہیں آنے جانے کی عادت ڈالو، دوست بناؤ تو تمہیں اوڑھنے پہننے کا شوق بھی ہو۔“

”ہے ناشوق۔ بہت ہے۔ اب اس کا کیا کیجئے کہ خاصی بد ذوق ہوں۔ ہمیشہ تو آپ میری شائنگ میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔ کبھی آپ کو کلر ڈول لگتے ہیں، کبھی اسٹائل آؤٹ آف ڈیس۔ بد دل ہو کے میں نے تو بننا سنورنا ہی چھوڑ دیا۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے سارا الزام ان پر رکھ رہی تھی۔

”بہت خوب۔ یوں باتیں بنا کے موضوع نہ بدلو۔ میں کہہ رہی ہوں، اچھا سا سوٹ نکالو، تیار ہو جاؤ اور مہندی کے فنکشن میں ضرور جاؤ۔“

رومیہ صدمہ میری جان۔ خوش رہا کرو تاکہ میں بھی خوش رہوں۔ تمہیں عام لڑکیوں سے مختلف زندگی گزارتے دیکھ کے مجھے اپنا آپ مجرم لگتا ہے جیسے۔

”پلیز مئی! اس میں گلٹ کی کیا بات ہے۔ اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ مجھے زیادہ شور شراب پسند نہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ کو اپنی خوشی کا یقین دلانے کے لیے ضروری ہے کہ میں سمارٹ شرٹس کے ساتھ دھوئی شلواریں یا پیالہ شلواریں پہنوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ ہونی پارلر جاؤں۔ بالوں میں اسٹروکنگ کرواؤں، ڈائریک ٹر کی لپ اسٹیک لگاؤں، کانوں میں کندھوں تک آتے ایئر

رنگز پہنوں۔“

”اسٹوپیڈ۔“ مسز نیلو فرٹار کے لبوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔

”اور رہا مہندی کے فنکشن میں شرکت کا سوال تو مئی۔ میں بور ہو جاؤں گی وہاں۔ کسی سے خاص علیک سلیک بھی تو نہیں۔“

”تو کرفس۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔ ”حق نواز کی فیملی سے تمہیں اسے نرمز بھانے چاہئیں۔“ انہوں نے وہ بات کی جو پہلے بھی دھکے چھپے الفاظ میں کئی بار کہہ چکی تھیں۔

”آپ کو پتہ ہے کہ جن لوگوں سے میرا مزاج نہ ملتا ہو، میں ان سے زیادہ تھکتی ملتی نہیں ہوں۔ حق نواز سے دوستی کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ساری فیملی سے میری فریکوئنسی ملتی ہوگی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان کے لیے ”ایلیمن“ ہوں۔“

”کیا۔۔۔ حق نواز اور تمہاری دوستی۔ صرف دوستی ہے؟“ پہلی بار انہوں نے کھل کے یہ سوال کیا جو انہیں اکثر تنگ کرتا تھا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور ان کی سائنڈ ٹیبل پر پزار رکارڈ کا چارٹ اٹھا کے دیکھنے لگی۔ ”تم میری بیٹی ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود میں جسمی طور پر تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی، البتہ حق نواز کے ہر انداز سے مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔“

”پاگل ہے وہ۔“ رومیہ صدمہ نے سر جھٹکا۔

”اس کا مطلب ہے میرا اندازہ غلط نہیں، پاگل ہی ہو گا جو پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے۔“ مسز فرٹار نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”اس نے کبھی کچھ کہا تم سے؟“

”کئی بار، لیکن اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔“

اس نے شانے اچکائے اور مسز نیلو فراس بار چڑ گئیں۔

”ہاں، اس کے کہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے، تمہی تو

ماں کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ بے چارہ کس لگتی

میں۔“

”وہو مچی۔ کیوں بے کار کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہے جس پر آپ سر کھپا رہی ہیں۔ دودن سے بی پی نارمل ہے، جو آپ سے برداشت نہیں ہو رہا۔“

”بے کار کی ٹینشن! تم میری بیٹی ہو، تمہاری عمر شادی کی ہے۔ کیا مجھے ٹینشن نہیں لینی چاہیے۔ بے چارہ حق نواز۔ اتنا بھلا لڑکا۔“

”اچھا بابا۔۔۔ چلی جاتی ہوں میں اس بے چارے بھلے لڑکے کے بھائی کی مہندی پہ۔۔۔ آپ کہیں تو لینگا پن کے بالوں میں پراندہ اور کانوں میں جھمکے بھی ڈال لوں؟“ اس نے بحث سے جان چھڑانا چاہی۔

”تمہیں اس طرح دیکھنے کا ارمان تو ہے مگر تمہاری اپنی شادی پر۔“ انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے اس کی پیشانی چومی۔

”مگر میں اکیلی جاؤں گی اور اس شرط پہ کہ دیر ہونے پر آپ پریشان نہیں ہوں گی۔ سنیعہ، آپ کے پاس گھر رہے گی۔ میں آپ کو رات کے وقت اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں پندرہ پندرہ منٹ بعد فون ضرور کرتی رہوں گی۔ پرامس۔“ وہ تیار ہونے لٹھ گئی۔

گھر آنے تک اس کا کوئی ارادہ نہ تھا مہندی میں شرکت کرنے کا لیکن ماں سے گفتگو نے کچھ اس رخ پہ پلٹا کھایا کہ وہ مزید نصیحتوں اور ہدایتوں سے بچنے کے لیے جانے پہ تیار ہو گئی۔

حمیرا اور زیتون خوش گپیاں لگاتی، ہنسی ٹھٹھول کرتی بازار سے واپس آرہی تھیں۔ آج چونکہ دینال ساتھ نہیں تھی، اس لیے زیتون، حمیرا کے کہنے پہ اسے گھر تک چھوڑنے آرہی تھی۔ وہ دونوں آگے آگے تھیں اور ان سے ایک قدیم پیچھے بلی اور نگی تھیں۔ نگی زیتون کی چھوٹی بہن تھی، جو بلی کی تقریباً ہم عمر تھی۔

”حمیرا! یہ جو تیری گلی کے محلہ پر دکان ہے، اس پر لکنا بونگا سا آدمی بیٹھتا ہے۔ اس دن تیرے گھر سے

واپسی پہ میں گلی کے لیے ٹائی لینے رکی تو دیکھا تھا۔“ توبہ سڑیل۔۔۔ کو جا۔“ زیتون نے اپنی کوکے والی موٹی سی ٹاک چڑھائی۔

”دفع کر۔ یہ محلہ ہی کو بے (بد صورت) لوگوں کا ہے۔ ذرا کوئی ڈھنگ کی شکل نہیں، سوائے میرے آصف کے۔“ یہ اترائی۔ اس کی پھوپھی بانو بھی اسی محلے میں رہتی تھی، اسی لیے تو آصف کا روز روز کا آنا جانا تھا۔

”ہائے نہیں باجی!“ بلی نے سڑک کے بہن سے کہا۔ ”صادق بھائی جان کے ایک کزن ہیں بڑے اسمارٹ سے، وہ آج کل دکان پر ہوتے ہیں۔“

”بھی صبح زیتون کے گھر سے نکلتے ہوئے تو میں نے دیکھا تھا۔ صادق کا بڑھا بابا بیٹھا کھاناں رہا تھا۔“

”اچھا۔۔۔ کل جب میں بیسن لینے آئی تھی تب تو وہی تھے۔ بڑا ہنس کے بات کی۔ ایک چیونٹم بھی دی۔“ ”چل حمیرا! ذرا دیکھیں تو سہی، کیا پتہ ہمیں بھی ایک ایک چیونٹم مل جائے۔“ زیتون نے آنکھ ماری۔ وہ خاصی دل پھینک تھی۔

”ارے واہ دیدہ دلیری تو دیکھو۔ اب دن ویساڑے ڈاکے پڑنے لگے۔“ زیتون نے دکان پہ پہنچتے ہی آنکھیں منکا کے کہا۔

”جی، کیا مطلب؟“ اس دن والے لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تو صدیق بھائی صاحب کی دکان ہے، آپ جناب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”ڈاکا ڈالنے والے سب کچھ سمیٹ کے چلتے بنے ہیں مس! جائے وقوعہ پہ بیٹھ کے مطالعہ نہیں فرماتے۔“ اس نے رسالہ لہرا کے دکھایا۔ زیتون کی سمجھ میں اس کی گاڑھی اردو نہ آئی۔ وہ جی این پڑھ تھی جبکہ حمیرا جو پانچ چھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی، مسکرا دی۔ شکل و صورت میں وہ کوئی حور پری نہ تھی لیکن زیتون کی نسبت بہتر تھی۔ اچھا پس اوڑھ کے اور بھی اچھی لگتی۔ بساط بھر میک اپ اور ہار سنگھار زیتون نے بھی کر رکھا تھا لیکن حمیرا کے کانوں کی سونے کی بالیاں،

قہقہہ ریشمی جوڑا، ہیل والی جوتی اور کلائی پہ بندھی
کویت سے آئی گھڑی اسے آسودہ خاندان کا ظاہر
کر رہی تھی۔ اس چیز نے بھی اس لڑکے کو مجبور کر دیا
کہ وہ زیتون کی بجائے دوسری لڑکی میں دلچسپی لے۔
”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مس؟“

”ہم میں سے کوئی استانی نہیں ہے جو مس مس
کر رہے ہو۔“ زیتون نے اپنی سمجھ کا مظاہرہ کیا۔ حمیرا
کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”بہت خوبصورت ہنسی ہے آپ کی۔“
چھوٹا سا شہر تھا، متوسط لوگوں کا محلہ۔ وہ لڑکا اگر
کچھ بے باک ہو رہا تھا تو اس کی وجہ ان شوخ لڑکیوں کی
جانب سے ملی ہوئی شہ تھی۔ جب انہیں کوئی تکلف
نہیں تھا تو وہ کیوں شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی
نظریں بے باکی سے ان بیٹی سنوری لڑکیوں کے سراپے
اور چہروں پہ پھسل رہی تھیں۔

”مسز کہہ لوں؟“ اس سوال پہ حمیرا کی ہنسی اور بھی
”تکھڑ“ گئی۔

”آپ کی ہنسی کہہ رہی ہے کہ آپ کو اس پہ
اعتراض نہیں۔“

”زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔“ اس نے
بڑے ناز سے بھنویں اچکائیں۔

”امید تو رکھ سکتا ہوں۔“
”اس پہ پابندی نہیں۔ میرا کیا جاتا ہے۔“

”میرا تو پانچ منٹ میں ہی بہت کچھ چلا گیا۔“
”لوجی، ادھر تو ڈانہ لاگ شروع ہو گئے۔ اب گانا

مت گانے بیٹھ جانا۔“ زیتون کے کبجے سے رشک اور
حسد دونوں چھلک رہے تھے۔ حمیرا ہمیشہ اس کو سائیڈ پہ

کر دیا کرتی تھی۔ اس کو جلتے دیکھ کر حمیرا کو اور مزہ آیا۔
وہ اس چھیڑ چھاڑ کو طول دینے لگی۔ لڑکے نے دونوں کو

مٹھادی بوتلیں بھی کھول کے دیں۔ بچیوں کو لالی پاپ
اور چائے کے پیکٹ پکڑائے۔ دوسرے ہل رہی تھی۔

کلی کے اندر گھورتوں کا آنا جانا اس وقت پھر بھی لگا رہتا
تھا۔ چائے دان کو اور کسی وقت کے مقابلے میں کہہ ہی

آئی تھی۔ اس کے قریب ہی اس مکان جس کے

سڑک کی جانب کھلتے تھے گلی سے بالکل الگ تھلک
تھی۔ سڑک پہ سے کبھی کوئی اٹو کا وٹین، رکشہ یا
سائیکل والا گزر جاتا۔

لڑکا خاصا چرب زبان تھا اور بڑھا لکھا بھی۔ اس نے
بتایا تھا کہ ابھی ابھی ایف اے کا امتحان دے کر یہاں
اپنی خالہ کے ہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوا ہے، اسی لیے
اس کا انداز گفتگو اور پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ یہاں کے
گنوار لڑکوں سے بہت بہتر تھا۔ کچھ اس لیے بھی اور
کچھ زیتون کے سامنے شہنی بگھارنے کے لیے، حمیرا
مسلل اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ اس کی
تعریفوں پہ شرمیلی اور مسکراتی۔ اس کے شوخ جملوں
کے بے تکلفانہ جواب دیتی رہی۔

”یہ لڑکے ادھر ہی آرہے ہیں۔ چل حمیرا! زیتون
نے اسے متوجہ کیا۔

”میرے دوست ہیں، گھبرا کیوں رہی ہو۔“ لڑکے کو
اپنے یاروں کے سامنے شومارنے کا موقع ملا تھا، وہ کیسے

ہاتھ سے جانے دیتا، اس لیے روک لیا۔ ان پہ رعب
جمانا چاہتا تھا کہ ان کے شر اور ان کے محلے آنے کے دو

ہی دن بعد وہ ایک لڑکی پھنسا چکا ہے۔ حمیرا گھبرا کے اسی
وقت پلٹ جانا چاہتی تھی کیونکہ ان میں سے دو لڑکے

اسی کی گلی کے تھے۔
”بھی جانے دو۔ وعدہ رہا کل پھر آؤں گی۔“

”میں انتظار کروں گا، قسم کھاؤ میری کہ ضرور
آؤں گی۔“ محض بیس منٹ کی ملاقات میں نوت قسموں

وعدوں تک آگئی تھی۔
”تمہاری قسم۔“ اس نے اس فلمی انداز میں کہا کہ

وہ لڑکا بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ بیٹھا۔
”آصف بھائی جان۔۔۔ باجی! وہ دیکھو۔“ بھلی کی آواز

پہ وہ کرنٹ کھا کے پلٹی۔
آصف اپنی سائیکل پہ سوار ان سے چند گز کے

فاصلے پہ تھا۔ اس کی گھورتی نظروں سے وہ اس طرح
خوفزدہ ہوئی کہ اور کچھ نہ سوچا تو جو ہاتھ اس لڑکے نے

تھام رکھا تھا، وہی ایک جھٹکے سے بچنے کے اس کے
چہرے پہ زور سے دے مارا۔ مقصد صرف آصف پہ یہ

ظاہر کرنا تھا کہ چھیڑ چھاڑ اس لڑکے کی جانب سے ہوئی تھی۔

لڑکا جو نئی نئی محبت کے خمار میں ڈوبا، ایک لڑکی کا ہاتھ تھامے نجانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا، تھپڑ کھا کے پہلے تو ہڑبڑا کے رہ گیا۔ اس نے بے یقینی سے اس لڑکی کو دیکھا جو تقریباً آدھے گھنٹے سے اس کے ساتھ تفریح کر رہی تھی اور اب چہرے پر غضب ناک تاثرات لیے اسے گالیاں دے رہی تھی۔ دو قدم کے فاصلے پہ کھڑے اس کے دوست اس کی بے عزتی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

آصف بھی سائیکل کھڑی کر کے آگے بڑھا۔ اس کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ حمیرا کے اشارہ کرنے پہ زیتون نے اسے آگے جانے سے روکا۔

”جانے دو بھائی جان! ایسے ہی کوئی لفظ ہے۔ حمیرا نے اچھا سبق سکھایا ہے۔ آپ جاؤ گے تو بات بڑھے گی۔ ابویں بیچاری کی بدنامی ہوگی۔“

”تو کیا میں بے غیرتوں کی طرح چپ چاپ واپس چلا جاؤں۔“

”اسی میں عقل مندی ہے۔“ حمیرا نے بھی آہستہ آواز میں کہا۔ ”مگر میرا بھائی یا چاچا ماما لڑتا تو اور بات تھی۔ تم منگیترو ہو۔ لوگ یہی کہیں گے، اس لڑکی کے پیچھے دو لڑکے مارا ماری کر رہے تھے۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

آصف انہیں لے کر گلی میں گھس گیا۔ دوسری جانب وہ لڑکا ابھی تک گل پہ ہاتھ رکھے کتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ آصف وغیرہ کے جاتے ہی اس کے دوست جو لڑائی جھگڑے کا خطرہ محسوس کر کے دور کھڑے تھے ٹپک کے اس کے پاس آئے۔

”یہ کیا تماشا تھا؟“ اوئے تجھے کیا ضرورت تھی اس کا ہاتھ پکڑنے کی۔ اپنے آپ کو بچ بچ کا ہیرو سمجھ بیٹھا تھا۔“ یہ تبصرہ اس دوست کا تھا جس نے اسے کسی ٹرک میں ہیرو کا خطاب دیا تھا اور اب سب ہی اسے ہیرو بنانے لگے تھے۔ ویسے تو وہ صادق کی خالہ کا بیٹا تھا لیکن صادق اور اس کے چھوٹے بھائی سے اس کی زیادہ

دوستی نہ تھی۔ شاید عمر اور مزاج کا فرق آڑے آتا ہو۔ وہ چونکہ دوستانہ فطرت کا تھا، اس لیے آتے ہی اس محلے میں ڈھیر سارے دوست بنالے جو اسی کی طرح کے تھے۔

”بڑی فتنہ لڑکی ہے۔“ سکتے سے باہر آتے ہی وہ اس لڑکی کو برا بھلا کہنے لگا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا یہاں کی لڑکیوں میں اتنی چالاکی نہیں ہوگی لیکن یہ چھوٹے شر کی عام سی لڑکی تو بہت تیز نکلی۔ پہلے خود فری ہوتی رہی، لفٹ دیتی رہی، ملنے ملانے کے وعدے بھی کر لیے اور جب بھائی کی شکل دیکھی تو تھپڑ مار کے چلتی بنی۔“

”وہ اس کا بھائی نہیں، منگیترو ہے اور بھائی کو بھی کم نہ سمجھتا۔ زیادہ نہ پھینک۔ ملنے کے وعدے۔ اوہ ہوس۔“ دوست نے مذاق اڑایا جو یہاں کا سب سے اوباش لڑکا تھا۔ اصل نام تو اس کا نجانے کیا تھا، سب ”نلی“ کے نام سے پکارتے تھے۔

”لڑکی سے مار کھا کے اب جھوٹی کہانیاں بنا رہا ہے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مکار لڑکیاں بو تلیں بھی پی گئیں۔ دوبارہ ہاتھ آئی تو چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے منہ پہ ہاتھ پھیر کے قسم کھائی۔

”چھوٹا چھوڑ، مٹی پاؤ یا را! ہیرو۔ آج شام کا کیا پروگرام ہے۔“ نلی نے سگریٹ سلگائی۔

”پہلے تو ایک کس مجھے لگانے دے، میسٹر ڈاؤن ہو رہا ہے۔“

”نہ ہیرو! پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں، اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ سادہ سگریٹ نہیں، اس میں پیریاں بھری ہیں۔“

”پیریاں۔۔۔؟ ہیرو کن پیتے ہو تم؟“

”تو نہیں یا را! وہ گندہ نشہ ہے۔ بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔ یہ تو چرس ہے، بڑی ہلکی چیز۔ زرا سرور ہی سرو۔ بالکل شراب کی طرح۔ یعنی نشہ تو ہے

بے ہوشی نہیں۔ اس کا سونا لگانے سے اندر باہر پیریاں ناچنے لگتی ہیں۔“

”ہیرو کی آنکھوں کے آگے تو اس وقت ستارے

ناچ رہے ہیں۔ ”ایک یار نے مذاق اڑایا۔ اس نے غصے کے مارے ٹلی کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی۔
دھوئیں کے مرغولے بتاتا وہ اب تک ذہن میں اس لڑکی کو مزہ چکھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔



آج ان لوگوں نے لڑکی والوں کے ہاں مندی لے کر جانا تھا۔ تیاریاں عروج پہ تھیں۔
”فوزی! یہ تمہاری منہ کیا پس کے آگئی ہے۔“
شاہ نواز نے بہن کو روک کے پوچھا۔

”کھنگا۔ وہی جو میں نے پہنا ہے۔“ اس نے اپنے لباس کی جانب اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھائیوں کی اکلونی بہن تھی اور کچھ عرصہ قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی اس لیے خوب ارمان نکال رہی تھی۔ ابھی بھی اپنا عروسی میروں بھاری کام والا لنگا پہنے ہوئے تھی۔
”اور آج تو زیادہ تر لڑکیوں نے لنگے ہی پہنے ہیں۔“
اس نے اپنی چھوٹی سی بچی کی پونیاں بناتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر اس کا حلیہ تو دیکھو! اتنی چھوٹی قیص اور دوپٹہ بھی نہیں لیا۔“

”بچی ہی تو ہے بھائی جان!“ فوزیہ کو برا لگا لیکن وہ ظاہر کیے بغیر بولی۔ شادی سے پہلے وہ بھائی کی بے جا روک ٹوک کا شکار تھی لیکن اب سسرال میں ماحول دوستانہ اور کھلا ڈالا تھا۔ اب اسے اپنے بھائی کی بے جا تنقید چھپتی تھی۔ اپنی بارہ تیرہ سالہ منہ کے بارے میں ان کا بصرہ اسے اچھا نہ لگا۔

”بچی ہے تو کیا بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔“ وہ تیوری چڑھا کے پوچھنے لگا۔

”پتہ نہیں امی نے کیا سوچ کے تمہارا رشتہ یہاں طے کر دیا۔ عجیب آزاد خیال اور بگڑے ہوئے لوگ ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ان کی صحبت میں تم بھی بگڑ نہ جاؤ۔“
”میں تو چھوڑ دیا ہے۔“ وہ بھائی کو اسی لیے کہتی تھی اب دیکھو اور کیا ہوتا باقی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اپنی بچی کو اس لڑکی سے اگلی سے بچا لے رکھنا۔ اس کی تربیت پہ برا

اثر پڑے گا۔“

”پلیز بھائی جان!“ وہ گھبرا گئی۔ اس کا سارا سسرال یہاں موجود تھا۔ شوہر بھی کہیں آس پاس تھا۔ اگر کسی کے کالوں میں بھنگ پڑ جاتی تو اس کے لیے صورت حال خطرناک ہو سکتی تھی۔

”تمہارے چہرے پہ بارہ کیوں بچے ہیں۔“ حق نواز کیرہ لینے اندر آیا تو فوزیہ کو آف موڈ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کے پوچھا۔

”ہمارے بہنوئی صاحب سے جھڑپ ہو گئی ہے کیا؟“

”شکر ہے ان کا دل غ نہیں پھرا ہوا جو وہ شادی والے گھر میں ایسی حرکتیں کرتے پھریں۔“ حق نواز بھی اس سے برا تھا لیکن شاہ نواز کی نسبت وہ اس سے بے تکلف تھی اور دل کی باتیں بھی کہہ لیا کرتی۔

”قسمت تو اس بے چاری کی خراب ہوگی جو کل اس گھر میں دلہن بن کے آئے گی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو! امی نے سنا تو فوراً بد شگونی کا فتویٰ صادر کر دیں گی۔“

”بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ ہریات میں اعتراض ہر چیز میں خرابی ڈھونڈ لیتے ہیں بھائی جان! چلو اپنی بہن کی حد تک تو ٹھیک ہے اب کسی غیر پہ اپنے اعتراضات ٹھونسنے کی کیا تنگ ہے۔“

زیر اپنی بہن کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ انہوں نے ان کے خیالات سن لیے تو بہت ماسٹڈ کریں گے۔ ان کے نزدیک تو ان کی بہن اب تک بچی ہے۔ بھائی جان کی طرح نہیں، جنہوں نے مجھے بچپن میں بھی کبھی دوست کے گھر جانے دیا نہ خود کہیں تفریح کے لیے لے کر گئے۔ ایسے حالات میں میں ان کی ہونے والی بیوی پہ

ترس نہ کھاؤں تو اور کیا کروں۔ کیا بنے گا بچاری کل۔“

”فکر مت کرو، میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ ایسے مرد ٹھیک ٹھاک قسم کے زن مرید ثابت ہوتے ہیں اور یہ جو تم اپنی بھابھی کے لیے اتنی ہمدردی دکھا رہی ہو تب

جل کر وہاں ہاں دے رہی ہوگی۔“

”جی نہیں، میں اس قسم کی منہ ثابت نہیں ہوں

کو زیادہ دیر ہو گئی تو اکیلے ڈرائیو کر کے جانا مشکل ہو گا۔

”اوکے“ اس سے زیادہ وہ کچھ کہہ نہ سکا ورنہ اسے اکیلے آنے سے روکنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ رومیہ بہت بااعتماد ہے اس کے گھر کا راستہ بھی خاصا بارونق ہے۔ رات کے آخری پیر تک وہاں ٹریفک رواں دواں رہتی ہے اور یہ بھی کہ اپنی پیشہ ورانہ فرائض ادا کرنے کے لیے بسا اوقات وہ اس سے بھی زیادہ رات تک اکیلے ڈرائیو کرتی ہے لیکن یہاں اس کا اکیلا آنا اس کی امی کو مزید معترض ہونے کا موقعہ فراہم کر سکتا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ وہ جانتا تھا کہ امی یہ سوال ضرور کریں گی اس لیے جواب بھی پہلے سے تیار تھا۔ ”ایک دوست کا۔“ یہ جواب کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

”کون سی دوست کا؟“ انہوں نے لفظ ”کون سی“ کو خاصا چبا چبا کر اور معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔ حق نواز گڑبڑا کے رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دیتے ہوئے اس نے ڈیک میں لگے گیت کا وائیم تیز کر دیا۔



چھوڑ کے گھر سنسان سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن
دہلیزوں کے کھیل نرالے
ہریاتل کے دیکھے بھالے
سوسو وہم گمان سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن

”سویرا! انکل جی آئے ہیں۔“ بینش کی آواز پہ وہ کسی گہرے خیال سے چوٹکی۔

وہی کمرہ تھا۔ وہی کھڑکی۔ اور وہی وہ۔

اس کا سادہ سا کمرہ جو کم سالانہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کشادہ محسوس ہوا کرتا تھا، آج کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مہندی کے سجے تھال، مٹھائی کے ٹوکڑے، ہار گجرے۔ ان سب کو مہمان بچوں سے بچانے کے

”تم لوگ اس وقت کون سی باتیں چھیڑے بیٹھے ہو۔“ ان کی امی تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ غجٹ ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

”مہندی لے کر نکلتا نہیں ہے کیا؟ شاہ نواز و یگن میں سب لڑکیوں اور عورتوں کو بٹھا رہا ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جلدی کرو۔“

”ویگن۔۔۔ وہی سیاہ شیشوں والی بڑی سی ویگن جو بھائی جان کے دوست کی ہے؟“ فوزیہ نے کھڑے ہو کر دوپٹہ سنبھالا۔ ”ان کا بس چلے تو فوج کی بکتر بند گاڑیوں میں ہم عورتوں کو لے کر جائیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔“

شاہ نواز اگرچہ اس وقت ساتھ نہیں جا رہا تھا مگر کچھ دیر بعد اپنے والد اور تایا کے ساتھ وہیں پہنچنے والا تھا کیونکہ مہندی کی رسم ادا ہونے کے بعد نکاح کیا جانا تھا۔ یہ ان کے ہاں کا رواج تھا۔ شادی سے کچھ روز قبل یا پھر مہندی والی رات کو ہی نکاح کا فرض ادا کر دیا جاتا تھا۔

”ہیلو۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے حق نواز نے سل فون پر چمکتے رومیہ کے نام کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کانٹوں سے لگایا۔ وہ یوں کم ہی فون کیا کرتی تھی اس لیے اس کا پہلا خیال اس کی ممی کی جانب ہی گیا کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔

”رسم شروع ہو گئی ہے کیا؟“ دوسری جانب سے بالکل خلاف توقع سوال کیا گیا۔

”ابھی کہاں ابھی تو رواجی ہو رہی ہے۔“

”وہاں کا جو ایڈریس کارڈ پر درج ہے، مہندی وہیں ہو رہی ہے یا کسی ہال میں؟“

”وہیں۔“ اس نے ماں کی موجودگی کی وجہ سے مختصر جواب دیا۔ البتہ لیوں پہ آتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں کایک پید ہوتی جھکڑ نے ان کو ہمت کچھ آجھادیا تھا۔ ان کی ناگواری یہی ظاہر کر رہی تھی۔

”تھیک ہے ہمیں کچھ دیر ہی ہونی لیکن زیادہ دیر رکوں گی نہیں۔ سنبھالو ممی کے پاس چھوڑا ہے اور رات

بیش کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گالوں
بستے آنسو اٹھیوں سے صاف کر کے دوبارہ نیچے دیکھنے
لگی۔ بیش دوبارہ سے پرناؤنی کے کپڑوں کی پینگنگ
کرنے لگی۔ وہ پچھلے دو دن سے سویرا کو اس کیفیت
میں دیکھ رہی تھی۔

لاکھ جتن کر دیکھے پورے

رہ جانے تھے رہے ادھر رہے

اماں کے ارمان، سہاگن

لوٹ چلی مہمان سہاگن

”اس کے ابا آئے تھے یہاں؟“

سویرا کی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے بیش
سے پوچھا۔

”جی، سویرا سے ملنے آئے تھے۔“

بیش کی بات پر انہوں نے غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ
پر دھنا چاہا جو ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

”بیش! یہ سرخ دوپٹہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا، کہیں
ادھر ادھر کسی کو تھما کے بھول نہ جانا، یہ تمہاری

درداری ہے۔ مہندی کی رسم کے بعد کھانے وغیرہ سے
فارغ ہو کے جیسے ہی لڑکا یہاں پہنچے گا، نکاح پر دھار دیا

جائے گا۔ اس وقت اس پہلے جوڑے پہ یہی سرخ دوپٹہ
اوڑھایا جائے گا۔ یہ بڑا برکتوں والا دوپٹہ ہے، میں اس

پہ بڑے پیرونی سے دم کروا کے لائی تھی۔ ان شاء اللہ
نکاح بھی ساتھ خیریت سے ہو گا اور آگے بھی کوئی بڑی

بلا آس پاس نہ پھٹے گی۔“

”بہت بھاری دوپٹہ ہے آنٹی! میں ایسا کرتی ہوں
الماری میں رکھ دیتی ہوں۔“

”دبلو! ایسا کر لو۔ ویسے بھی نکاح کے وقت اسے
میں لایا جائے گا۔ بس یہ یاد رہے نکاح کے وقت یہ سر

پہ ہو۔“ وہ جاتے جاتے تاکید کر گئیں۔ بیش مڑ کے
الماری میں وہ سرخ جھلملاتا دوپٹہ رکھ رہی تھی، اس

لیے سویرا کے ہونٹوں پہ آئی وہ عجیب سی مسکراہٹ نہ
دیکھ سکی۔

ایسی مسکراہٹ جس میں طنز کے ساتھ ساتھ ایک
ہمدردی بھی تھی۔

لیے سب سے محفوظ کمرہ یہی تھا، اس لیے ان کا ڈھیر بیڈ
’صوفے اور کارپٹ‘ پر بڑا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی
طور پر سر سے ذرا کھسکا ہوا سنہرے گوٹے سے سجاوٹ
اور پیلا چڑی کا دوپٹہ اور آگے تک کھینچ لیا۔ بیش نے
حیرت سے اسے آدھے چہرے تک آپٹل پھیلاتے اور
قدرے ذرا سارخ موڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے گھر کا
ماحول بہت دوستانہ تھا۔ وہ اور اس کی بہنیں اپنی ماما سے
زیادہ پیلا سے قریب رہی تھیں لیکن سویرا سے چار سالہ
دوستی کے دوران اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے ابو
سے کتراتی تھی۔ اس کا سامنا جب بھی سویرا کے ابو
سے ہوا، اس نے انہیں بہت مشفق اور نرم خوبایا پھر
پتہ نہیں کیا وجہ تھی جو وہ ان کا سامنا ہونے پر گھبرا جاتی
تھی۔ بیش نے اس کے ابو کو بھی کبھی اپنی بیٹی سے
رسمی یا ضرورت کے چند فقرے کہنے کے علاوہ کوئی
دوسری بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آج شاید پہلی بار
ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا
تھا۔ کم از کم بیش کی موجودگی میں تو پہلی بار۔

سویرا سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔
”انکل جی! آپ کو سویرا سے کوئی بات کرنی ہے تو

میں باہر چلی جاتی ہوں۔“ بیش نے انہیں کافی دیر تک
بیٹی کے سامنے چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو بول اٹھی۔

”نہیں۔“ ان کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی
مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہو گئی۔ انہوں نے نظریں

اٹھا کر سویرا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا
رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ کپکپاتا ہوا آگے بڑھا اور اس

کے سر پہ ٹھہر گیا۔ اس کا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔ گود
میں دھرے ہاتھوں پہ آنسوؤں کے چند قطرے گرے

تھے۔

”تمہیں اللہ کی اماں میں دیا۔“ کہتے ہوئے وہ اٹھ
کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد سویرا نے اپنا سر دوبارہ گھر کی
سے نکال دیا۔

”انکل جی بہت ادا اس لگ رہے تھے تمہارے
جوان کا خیال تک کر رہا ہو گا۔“

مہمانوں کو گھر جانا ہے
اک دن چھوڑ کے دُور جانا ہے
رَب کے پاس امان سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن

وہ ایک بار پھر نیچے لان میں دیکھ رہی تھی جہاں اس کے خاندان کے تقریباً سب ہی لوگ جمع تھے۔ بڑے کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لڑکیاں زرق برق ملبوسات میں اٹھلاتی۔ گانوں اور ڈانس کی پریکٹس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ بچے یہاں سے وہاں بھاگتے نظر آ رہے تھے۔

کوئی وقت جاتا تھا جب لڑکے والے یہاں پہنچ جاتے اور اس کے بعد کچھ گھنٹوں بعد وہ اسے سونپ دی جائے گی جس کی امانت تھی۔
”امانت...؟ کیا واقعی امانت کو امانت کی طرح سونپا جا رہا ہے؟“ اس نے افسردگی سے سوچا۔

اس کی نظر گیٹ کے نزدیک کھڑے اپنے باپ کے چہرے کی جانب گئی جہاں ایکابی مسرت تھلکنے لگی تھی۔ انہوں نے دور کھڑی کسی سے بات کرتی بیگم کو آواز دے کر اس طرف بلایا۔ شاید لڑکے والے آگئے ہوں گے۔

اتنے شور اور فاصلے کی وجہ سے سوراان کی آواز تو نہ سن سکی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ یقیناً ان کی آواز جوش جذبات سے کپکپا رہی ہوگی۔

”تین سالوں بعد میں آج ابوجی کو خوش دیکھ رہی ہوں۔ اللہ میاں جی... اگر ان کی یہ خوشی میری خوشیوں سے وابستہ ہے تو میری دعا ہے اللہ کہ میں ہمیشہ خوش رہوں۔“ پہلی بار اس نے اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے ایک خوش آئند دعا مانگی۔

پنکے لگے دل کو اچانک سکون سا آگیا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک سے اٹھ گئی اور پردہ گرا دیا۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

”سیدھیانہ تو رہا اچھا ملا ہے عظیمت بی بی! بس دعا کرو کہ لڑکی بعد میں بھی اتنی اچھی ثابت ہو جیسی اب لگ

رہی ہے۔ میں نے تو اپنی جانب سے بہت چھان بھٹک کے دلہن ڈھونڈی ہے۔ بڑھی لکھی بھی ہے اور پردہ نماز روزے کی پابند بھی۔ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری نظر نہیں آتی۔“ حق نواز کی امی نسیم بیگم اپنی کسی عزیزہ سے بات کر رہی تھیں جو شکل و صورت سے ہی خاصی جماندیدہ لگ رہی تھیں۔ ان کی بات سن کر بڑے مدبرانہ انداز میں مسکرائیں۔

”نظر نہیں آتی یا ہے نہیں؟ بہت فرق ہے دونوں باتوں میں نسیم! اور یہ بات تو میں پہلے بھی کہتی تھی۔ اب بھی کہتی ہوں کہ لوگوں کو پرکھنے میں تم بالکل کوری ہو۔ جہاں اتنا وقت لگایا ہو ڈھونڈنے میں وہاں کچھ عرصہ اور ٹھہر جاتی۔ میں عمرہ کر کے لوٹ ہی آتی پھر دیکھ بھال کے جانچ پرکھ کے بات طے کرتے پہلے تو کوئی بات تم نے میرے مشورے کے بغیر نہیں کی تھی۔ فوزیہ کے معاملے میں بھی مجھے آگے آگے رکھا اور اب...“ ان کے انداز میں گلہ تھا۔

”بس مجھے ڈر تھا کہ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ یوں بھی عظمت بی بی! اب نسیم ایسی سو قوف بھی نہیں رہی۔ تمہاری صحبت کا اثر ہے۔“ انہوں نے اتر کے گردن ہلائی۔

”آؤ تمہیں اپنے سہ ہیانے سے ملواتی ہوں۔ بہت سیدھے سادے شریف لوگ ہیں پیسہ بھی ہے لیکن نہ اکڑے نہ نخرے۔ باپ نے بھی نظر ملا کے بات نہیں کی۔ اتنا انکسار ہے اس شخص میں۔ وہ دیکھو بھائی فضل کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا ہے سفید لباس میں۔“

”ہاں دیکھنے میں تو بھلا آدمی لگ رہا ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے لڑکی کا؟“

”نہیں، بس یہ تین بہنیں ہی ہیں۔ وہ بڑی والی ہے۔ اس کامیاں تمہارے بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ بہت کھاتے بیٹے لوگ ہیں۔“

”میاں تو اس کا عمر میں خاصا بڑا لگ رہا ہے اور یہ خود تیس پینتیس سے زیادہ کی نہیں۔ بڑی والی کے لیے

تمہارا۔ ویسے اس دن ہوا کیا تھا؟ اتنی شوخی کیوں ہو رہی تھی اس لڑکے کے ساتھ؟

”پتہ نہیں کیا ہوا تھا؟ وہ لڑکا بھی تو۔“ حمیرا کے لبوں پر اس کی چمچے دار باتیں یاد کر کے مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ زیتون کے تن بدن میں اس مسکراہٹ نے آگ لگا دی۔ اسے ایسے بہت سے واقعات یاد آنے لگے۔ جب حمیرا نے اس کی اچھی بھلی شروع ہوتی لوائسٹوری میں اپنی انٹری دے کر کہانی کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔ حالانکہ اس کی منگنی اچھی بھلی اپنے چھوٹی زاد آصف سے ملے تھی جسے وہ پسند بھی کرتی تھی۔ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے آگے وہ کبھی نہ بڑھتی تھی مگر زیتون کا کام ضرور خراب کر جاتی۔

”لگتا ہے تیرا دل اس لڑکے پر آگیا ہے۔ اس بلی عمر والے لڑکے پر۔ سوہنا بھی تو رنج کے ہے۔ آصف بھائی جان تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔“

”ابویں کچھ نہیں۔“ حمیرا برا مان گئی۔ ”کہاں آصف؟ کہاں یہ لوٹا۔ وہ تو میں ایسے ہی دل لگی کر رہی تھی ورنہ جو آصف میرے لیے ہیں وہ کوئی اور نہیں۔ زندگی تو مجھے ان کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ کسی فضول سی بات کے پیچھے میں ان کو خفا نہیں کر سکتی۔“

”اچھا۔ میں تو آئی تھی تجھے لینے۔ ابھی آتے ہوئے میں نے اس دکان میں اسی لڑکے کو دیکھا تھا جسے سارے ہیرو، ہیرو کہتے ہیں۔ میری منت کر کے کہہ رہا تھا کہ ایک بار تجھے اس دکان پر لے آؤں۔“

”نہ بابا۔“ حمیرا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”میری توبہ۔ میری طرف سے صاف جواب ہے۔ دفعہ دور ایسی دل لگی اور ہنسی مذاق جس کی وجہ سے زندگی عذاب میں پڑ جائے اس دن کی غلطی کے بعد اب مجھے عقل آگئی ہے۔“

”ہو نہ ہو، سو چو ہے کھا کے تلی جج کو چلی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھی۔ صحن میں وہی معمول کی بحث جاری تھی۔ داوی کو کھانسی ہو رہی تھی اور ذکیہ بھلی پہ چلا رہی تھی۔

”ڈھیٹ ہڈی اٹھ جا، داوی کو میٹھی گولیاں ملا دے۔“

یہ بڑھا کیوں ڈھونڈا ان لوگوں نے؟ عظمت بی بی کی جانب سے پہلا اعتراض آیا جس کا فوری جواب تنیم بیگم سے بن نہ پڑا۔ یہ سوال کئی بار ان کے ذہن میں بھی گلبلا یا مگر وہ دیا گئیں، یہ سوچ کر کہ وہ لوگ برا نہ مان جائیں۔

”وہ دوسری والی ہے جس نے بچہ گود میں اٹھا رکھا ہے اور وہ جو اس طرف کھڑی مووی والے کو ہدایات دے رہی ہے وہ لڑکی کی ماں ہے۔ بڑی ہنس مکھ عورت ہے۔“

”دور دور سے ہی تعارف کراؤ گی۔ بھی ملو او تو سہی۔ ہم بھی تو دیکھیں، کیا سیانا پن دکھایا ہے تنیم بیگم نے اس بار۔“ ان کے تیور سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں اپنی اس عزیزہ کی فہم و فراست پہ خاص بھروسہ نہ تھا۔

”بہن! یہ عظمت بی بی۔ میری چچا زاد، میری سہیلی، میری بہن۔ بہت سے رشتے ہیں ان سے میرے۔“ انہوں نے نزدیک جا کے سویرا کی امی سے ان کا تعارف کرایا۔

”اور یہ ذکیہ بہن ہیں، ہماری ہونے والی بہو سویرا کی والدہ۔“

”ذکیہ۔! عظمت بی بی جو ان کی صورت نزدیک سے دیکھ کر ہی ٹھنک گئی تھیں، نام سن کے چونک گئیں اور بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگیں جیسے کچھ یاد کر رہی ہوں۔“

”اس دن تو سمجھو، آصف بھائی جان کے ہاتھوں تیرا قتل ہی ہو جاتا تھا۔“

زیتون کچھ دنوں بعد ملی تو وہی بات یاد کر کے اسے ڈرانے لگی۔

”ہاں، اس دن تو شامت آتے آتے رہ گئی تھی۔ وہ تو میرا دل کا کام کر گیا۔ مجھے یہ ڈرا ٹھنک نہیں گیا آصف کا۔ انا میری دھاک بیٹھ گئی کہ کیا لڑکی ہے، چھیڑنے والے کو مزہ چکھا دیا۔“

”ہاں، ایسے معاملوں میں دماغ تو خوب چلتا ہے

کھانسی کا شروت ختم ہوا پڑا ہے یہاں سے تو ملنے کا نہیں۔ میرے سر میں مندی تھی ہے، سردھو کے بازار نکلوں گی تو دو الاؤں گی۔ تب تک بے چاری میٹھی فو لیاں ہی چوس لے گی ورنہ کھانسی کھانسی کے اس کا انجر پھریل جائے گا۔

”ہی! میرا جی نہیں کر رہا گرمی میں نکلنے کو اتنی دھوپ ہے۔ دوپہر کے بعد۔“

”دوپہر کے بعد تو میں بھی دو الے آؤں گی۔“

”اری ذکیہ! فرخ سے کہہ دے۔“ وادی نے کھانستے ہوئے کہا۔

”وہ سو رہا ہے اماں! اور یہ بڑا حرام ویلے تو اندر باہر کے سوچ کر لگاتی ہے جب میں کسی کام کا بولوں تو اسے موت آتی ہے۔ جاتی ہے یا اٹھاؤں چل۔“

نہتوں نے جلے دل کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور بغیر کسی سے مخاطب ہوئے وہاں سے نکل گئی۔ اس کا رخ سیدھا صادق کی دکان کی جانب تھا۔

”وہ تو نہیں آ رہی نہ ہی ایسے آنے والی ہے۔ بہت تیز لڑکی ہے۔“ ہیرو کے سامنے کھڑی وہ حلے دل کے پھپھو لے پھوڑ رہی تھی۔ اس کا دوست ٹلی بھی پاس کھڑا تھا۔

”وہ تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی بلکہ مذاق اڑا رہی تھی۔ توبہ توبہ۔ اتنے بڑے بول بک رہی تھی کہ میرا تو دل کانپ گیا۔ بڑا ہی خنہ ہے اس میں۔ اگر ذرا شکل اچھی ہوتی تب پتہ نہیں کیا حال ہوتا۔ کہہ رہی تھی اس دو ٹکے کے دکان دار کو کہنا اپنی اوقات میں رہے۔ اس جیسے تو ہم گھر پہ ملازم بھی نہ رکھیں۔ نہ منہ نہ متھا جن پہاڑوں تھا۔“

”خود بڑی حور پرری ہے۔“ ہیرو کا تو غم وغصے سے برا حال تھا البتہ اس کے دوست ٹلی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

”نزدیک ہی اس کی چھوٹی سی دکان تھی جہاں اس نے اسنوکر ٹیبل اور دو چار اور گیمز رکھے ہوئے تھے۔ اب تو ایک وی سی آؤ بھی رکھ لیا تھا۔ فلموں کے شوقین اسی منی سینما گھر میں ٹکٹ خرید کے اپنا

چسکا پانی کرتے تھے۔ کچھ عرصہ گزرا تو انہوں نے

ایک آدھ بار اس منی سینما گھر کے خلاف آواز بھی اٹھائی تھی جو یہاں کے کچے فنوں کو مخرب الاخلاق فلمیں دکھا کر گمراہ کر رہا تھا ٹکڑی بیٹھ صاف بچ نکلا۔ بد کردار اور بد زبان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک کائیاں شخص بھی تھا۔ اب بھی اس کی باتیں جلتی پہ تیل کا کام کر رہی تھیں۔

”چھا ہیرو ہے تو یار! ذرا سی لونڈیا کھڑے کھڑے دس لوگوں کے سامنے بھرے بازار میں تجھے تھپڑ مار کے چلی گئی جبکہ غلطی بھی تیری نہیں تھی۔ تو کوئی اس کے پیچھے گیا تھا چھیڑنے ذرا اکڑ دیکھو۔ نکلے نکلے کی بات سنائی یاد نہیں؟“

اس دن کا پھٹرا سے اب تک نہیں بھولا تھا۔ شہزاد اور زیتون کی لگائی بھائی۔ وہ پوری طرح سے بھر گیا۔ ”مجھے معمولی دکاندار کہا اس نے؟ میں تو صادق بھائی کی بیماری کا خیال کر کے یہاں گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتا ہوں، ورنہ میں اور دکاندار۔ آج تو آیا ہی صرف اس کی خاطر تھا اور اس کی یہ ہمت۔ لڑکی ہے اس لیے لحاظ کر رہا ہوں۔“

”ضرورت کیا ہے لحاظ کرنے کی۔ بے عزتی، بے عزتی ہے۔ چاہے کوئی بھی کرے۔ لڑکی کرے تب تو دوہری بے عزتی ہے۔ بدلہ لیتا ہی مرد کی شان ہے۔“ ٹلی نے اکسایا۔

”چل چھوڑ تو اس وقت آؤٹ ہو رہا ہے۔ دفع کر اس دکان کو۔ شرگرا اور میری دکان پہ آ۔ کیا گرامر فلم ہے اور کیا نئے ٹکڑے سکرٹ ہیں۔ سوا آجائے گا۔“ اس کے کہنے پہ وہ دکان بند کرنے لگا۔

”وہ دیکھ اسی پٹانے کی چھوٹی بہن پھلجھری۔“ ٹلی نے شہو کا دے کر اسے متوجہ کیا۔ سامنے سینما گلی میں سے بلی بے زارسی شکل بنائے چلی آ رہی تھی۔

”اور چھ سات سالوں بعد اس نے پتہ نہیں کتنے فساد ڈالنے ہیں۔ بڑی والی سے دو ہاتھ آگے ہی ہوئی۔“ اس نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا اور شرکو تالا لگانے لگا۔

”دکان بند ہو گئی ہے؟ میں نے گولیاں لینی

نے دس بارہ سال کویت میں لگائے ہیں۔ "تسینیم بیگم بھی چونکیں۔ ان کے خیال میں عظمت بی بی جن کی یادداشت قابل رشک ہے اگر ان کی بات درست ہے تو سویرا کی امی نگر کیوں رہی ہیں۔

"ہاں اور پھر وہاں سے سب کام دھندہ چھوڑ کے یہاں بھاگے بھاگے کیوں آئے؟ یہ نہیں بتایا؟" وہ چمک کے بولیں۔

"یہ وہی ذکیہ ہیں جن کو میں جانتی تھی۔ یا تو یہ مجھے بھول چکی ہیں یا بھول جانے کی اداکاری کر رہی ہیں۔ بہر حال اگر بھول رہی ہیں تو ذکیہ صاحبہ میں یاد دلا دوں کہ بوروالہ میں جس محلے میں آپ رہا کرتی تھیں، وہیں میرے بھائی بھابھی کا گھر بھی تھا۔ ان کے آپ لوگوں سے اچھے مراسم تھے کیونکہ اس محلے کے چند متمول گھرانوں میں سے ایک آپ کا گھر تھا۔ آپ کے شوہر کویت میں اچھا خاصا کمار رہے تھے۔" ان کی آواز اتنی بلند اور انداز اس قدر جارحانہ تھا کہ اس پاس اپنی سرگرمیوں میں مشغول سب ہی لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ کئی خواتین تو نزدیک جمع ہو چکی تھیں تاکہ اصل صورت حال کا اندازہ ہو سکے۔

"آپ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا کرتا تھا، ایک بوڑھی ساس تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

ذکیہ گرنے کے سے انداز میں نزدیکی کر سی۔ پیٹھ گٹس۔ ان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ ان کی منجھلی ٹیٹی اور ایک قریبی عزیزہ ان کو سہارا دینے قریب چلی آئیں۔ ان کے شوہر کو کسی نے اس جانب متوجہ کیا تو وہ بھی سست قدم اٹھاتے اس طرف بڑھنے لگے۔

"آپ شاید میں بھی یاد آجاؤں۔ میں 'عظمت بی بی' اپنے بھائی منظور اور بھابھی زلیخا کے پاس انہی دنوں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔" "ان ہی دنوں پہ وہ بہت زور دے کر بولیں۔ ذکیہ نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

"میرا بیٹا پیدا ہونے والا تھا، دو ڈھائی مہینے تک وہاں رکی تھی میں اس لیے آپ۔ آپ کے ساتھ ہونے والا حادثہ۔ آپ کا وہاں سے جانا اور پھر آپ کے جانے

تھیں۔" وہ نزدیک آ کے مایوسی سے بولی۔ تب دونوں دو دکانیں چھوڑ کے تیسری دکان تک جا چکے تھے جو ٹلی کی تھی۔ یہاں دوپہر کے وقت اکثر دکانیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے بند ہو جایا کرتیں۔

"کون سی گولیاں، کچی یا پکی؟" ٹلی نے اپنے پیلے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

"وہاں تو ختم ہو چکی ہیں۔ آؤ میں یہاں سے دے دیتا ہوں۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑے دوست کو آنکھ ماری جو نہ سمجھنے کے عالم میں کھڑا نگر نگر اسے دیکھ رہا تھا۔ بلی نے چند سیکنڈ رک کے سوچا۔ گھر واپس جانی تو امی پچھلی گلی والے کھوکھے تک بھیج دیتی۔ ایک اور چمک۔ اس سے بچنے کی خاطر وہ ٹلی کے ساتھ اس کی دکان میں چلی گئی۔

"ذکیہ! کہیں تم بوروالہ کے رہنے والے تو نہیں ہو؟" چند منٹ تک تو عظمت بی بی چپ چاپ کھڑی انہیں دیکھتی رہیں جیسے اپنی یادداشت کھنگال رہی ہوں پھر پورے وثوق سے سوال کیا تھا۔ ذکیہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ہم تو ادھر ہی۔ لاہور سے ہی ہیں۔" دائیں بائیں دیکھتی وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔ اس بات پہ عظمت بی بی کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔

"نہیں، آج سے آٹھ دس سال پہلے تم لوگ بوروالہ میں رہتے تھے۔"

"نہیں عظمت بی بی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" تسینیم بیگم نے مداخلت کی۔

"ان کے میاں عابد چودھری تو ادھر کے بڑے مشہور کپڑے کے تاجر ہیں۔ شاہ عالم مارکیٹ میں ہول

سل کی دکانیں ہیں۔" عابد چودھری۔ ہاں یہی نام تھا۔ یہ تو وہی ہیں۔

پہلے یہ بوروالہ میں رہتے تھے اور یہ عابد چودھری کویت میں ہوتا تھا۔

پہلی یہ تو جانتا تھا۔ اس نے ایک بار کہ ان کے میاں

کے بعد کے بھی تمام حالات و واقعات مجھے خوب اچھی طرح یاد ہیں۔

”کسے واقعات کیا ہوا تھا؟ کیوں چھوڑا انہوں نے اپنا پرانا شہر؟“ اب تو نسیم بیگم بھی مجس تھیں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟“ حق نواز کو

بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ یوں مجمع لگا کر یہ سب

ڈمکس کرنا۔ اگرچہ ہونے والی بھابھی کے والدین کے

تاثرات اور دیگر رشتے داروں کی دلی دلی سرگوشیاں ظاہر

کر رہی تھیں کہ وہ لوگ واقعی کچھ چھپانا چاہ رہے

ہیں۔ اصل بات وہ بھی جانتا چاہتا تھا کہ چھپائی جانے

والی بات سنگین بھی ہو سکتی تھی لیکن دوسری طرف

اسے سامنے بیٹھی خاتون کی دگرگوں حالت اور اپنے

ساتھ کھڑے اس شخص کی بے چارگی پہ ترس آ رہا تھا

جن کی بیٹی کے لیے وہ کل بارات لائے والے تھے۔

اب اپنا پر مشرودہ چروں میں امید کی ایک رمت نظر نہ

آ رہی تھی۔

”ہو سکتا ہے عظمت آنٹی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔

یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ جن خاتون کا ذکر کر رہی ہیں ان کی

تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بتا رہی ہیں جبکہ ذکیہ آنٹی کا تو

کوئی بیٹا ہی نہیں۔“ اس نے بات سنبھالنا چاہی۔

”اب نہیں ہوگا“ پہلے تو تھا اور ان سے پوچھیں کہ

کہاں گیا ان کا وہ قاتل بیٹا۔“

”بہن جی۔“ سویرا کے ابو آگے بڑھے اور سر جھکا

کے اپنے جڑے ہوئے ہاتھ ان کے آگے کر دیے۔

”قاتل بیٹا۔ واقعی؟“ ہر جانب چہ گویاں شروع

ہو گئیں۔ اب سب ہی عظمت بی بی سے تفصیل

جاننے کے خواہش مند تھے اور وہ بڑی شہانہ سے گردن

اٹھائے اپنے سامنے دو مجبور و بے بس انسانوں کی

بے چارگی کا مزہ لے رہی تھیں جن کی اس وقت شدت

سے یہ چاہ ہو گی کہ اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لیے

بند ہو جائے یا کھلنے سے پہلے وہ دونوں زمین میں سما

جائیں۔

اس ہجوم سے ذرا فاصلے پہ کھڑی دودھ مہو نے یہ

مظاہرے مانتے سے دیکھا۔

”اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی کسی مجرمانہ حرکت کو

چھپا کر اپنی بیٹی کا گھر سنا چلا ہے تو ایسا کیا برا کیا ہے

بیٹے کی غلط حرکت کی سزا بے قصور بیٹی کو نہ ملے، یہی

سوچا ہو گا انہوں نے اور اگر یہ خاتون یہ راز جانتی ہی

ہیں تو یوں مجمع لگا کر انکشاف کرنے سے انہیں کیا ملے

گاہ پتہ نہیں ہمارے معاشرے میں ایک فرد کے گناہ

کی سزا اس کے سارے خاندان کو کیوں دی جاتی

ہے سوہ چپ چاپ سوچ رہی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ

کر بھی نہیں سکتی تھی جن پہ بندھے ہاتھوں کی التجا اثر

نہ کرے ان سخت دلوں کو وہ کیسے اس بے رحمانہ

حرکت سے باز رکھ سکتی تھی۔

”ان کے صاحبزادے نے پندرہ سال کی عمر میں قتل

کیا تھا“ اپنے ہی ایک محلے دار لڑکے کا۔ اب پتہ نہیں وہ

ابھی تک جیل میں سڑ رہا ہے یا مر کھپ گیا ہے اور ان

کی وہ لڑکی جس کی وجہ سے قتل ہوا ہے وہ بھی پتہ

نہیں۔ ارے۔“ وہ بات کرتے کرتے اچھل

پڑیں۔

”دیکھیں جی ہاں ہمارے چھوٹے بھائی سے غلطی

ہوئی۔ ہم نے ماما۔“ سویرا کی بڑی بہن آگے بڑھی۔

”آپ کو یہاں رشتہ نہیں کرتا بے شک واپس چلے

جائیں۔ یوں تماشا بنانے کی ضرورت نہیں۔“ اس

کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

”مے لڑکی! تماشا تو تم ہم شریف لوگوں کا بنانے

چلی تھی۔ وہ تو بھلے وقت میں مجھے یاد آ گیا کہ تین

لڑکیوں میں وہ سب سے چھوٹی والی ہی تھی اور یہ لڑکی

جسے میری بہن انجانے میں ہو بنانے چلی تھی وہ بھی

سب سے چھوٹی والی ہے۔ میں تو سب کو خبردار کر کے

جاؤں گی۔ کہیں تم ہمارے بعد کسی اور کو بے وقوف بنا

ڈالو۔“ وہ مڑ کے سب کو اعلان کرنے والے انداز میں

مخاطب کرنے لگیں۔

”ان کے بیٹے نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا وہ اصل

میں تھا ہی مارے جانے کے قابل۔ ذیل نے ایک

چھوٹی سی نو دس سال کی بچی سے زیادتی کی تھی اور وہ

بچی ان ہی کی تھی۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی۔“

بالآخر انہوں نے دھماکا کر ہی ڈالا۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

شہیم یکم اپنی بیوی کے ساتھ انکشاف کرتی ہیں کہ ان کے سوا کسی اور وہابی کی کئی کئی اور وہابی کئی اور نہیں سویرا عرف بلی ہی ہے۔
جانی ہیں اور سب کے سامنے انکشاف کرتی ہیں کہ ان کے سوا کسی اور وہابی کئی کئی اور نہیں سویرا عرف بلی ہی ہے۔
قابل ہے بلکہ اس کی بیٹی کے ساتھ انکشاف کرتی ہیں کہ ان کے سوا کسی اور وہابی کئی کئی اور نہیں سویرا عرف بلی ہی ہے۔

۲

دوسرا اور آخری حصہ

وہ نیچے کی طرف آئی بیڑھیوں پہ کھڑی تھی۔ ابھی اس نے دو ہی زینے طے کیے تھے۔ اس کے سر کے گولے کے کام سے بوجھل سبز چادر کا سایہ جس کے چاروں کونے اس کی بہن سمیرا، دوست بنیش اور کرنز ردا، مریم اور روشی نے تھام رکھے تھے وہ چاروں بھی گم صم پھرنی کھڑی تھیں۔

گھٹنوں کے بل نیچے زمین پہ سر جھکائے بیٹھا شخص جس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے گیلی ہو رہی تھی وہ اس کا باب تھا۔

یہ بین اس کے بھی نہیں تھے۔ وہ بین کرتا ضرور تھا، سالوں سے کر رہا تھا مگر یہ بین سنائی دے جانے والے نہیں تھے۔ اس کی ایک نگاہ ہی سو کے بین بھاری ہوتی تھی۔ وہ ایک نگاہ جو وہ سویرا پہ ڈالنے کے بعد اوپر آسمان کی جانب کرتا تھا۔

اس کی بہن سمیرا زرد چو لے اپنے عمر سیدم نازک مزاج شوہر کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دور رہی تھی۔ یہ بین اس کے بھی نہیں تھے بلکہ اندر اندر وہ بین ڈالنے کی تیاری ضرور کر رہی ہوگی۔

کچھ ابھی ہوا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ اس کے خلاف نظر آ رہا تھا۔

عظمت بلی نے گویا سب کے سروں پہ ہم پھوڑ دیا تھا۔

لیکن نہیں۔ ہم پھنسنے کے بعد تو دھماکا ہوتا ہے۔ کمرام بچ جاتا ہے۔ ہر جانب بھگدڑ مچ جاتی ہے جبکہ میل ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس کے برعکس میل موجود تمام نفوس کو جیسے کسی نے جاو کی چھڑی گھما کے پتھر کا کر دیا تھا۔

ہر شخص۔ ہر منظر۔ ہر جگہ۔ سب کچھ ساکت تھا۔ بس ایک چیز تھی جس کی آواز بہت تیز تھی۔

یہ دل تھا۔ سویرا کا دل۔ جو یوں دھڑک رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آجائے گا۔ ہر جانب ایک گہری خاموشی ہونے کے باوجود وہ واحد تھی جس کے ارد گرد قیامت کا شور تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں ساکھیں۔ دھڑ دھڑ۔ دھک دھک۔ ہر قسم کا شور پاتا تھا۔ کہیں دور سے بہت مانوس سے بین بھی سنائی دے رہے تھے۔

یہ کس کے بین تھے؟ کون دہائیاں دے دے کر دور باتھا؟

اس نے دھنن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے سب یہ نظر دوڑائی۔

تھی۔ میرا ہی ہزار کافی ہو تو میں اس سے چند رہا تھا لیکن
 آج وہ بھی واپس اپنے شہر چلا گیا ہے۔ اسی کو لاری
 اسے چھوڑ کے رہا ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ
 رہی تھی وہ چارہ کی۔ شاید کچھ نہ کئی ہو۔ کوئی بھی
 تو جو نہ اس کے۔

ہاں ہاں۔ فریسی بھی کہہ رہی تھی۔ اس کا
 طویل چپن بنے کے دروں ہی وہ بھرتے چنے مار کے
 روٹے تھے۔

تک وہ اسے دھو کر کھانہ کھا رہی تھیں۔
 کسی کھانے کے گھر میں تھی۔ کسی نے اسے کئی کھانے
 کئے تھے۔ طبیعت نہیں۔ بھلا تھی۔ دھن بھی نہ تھی
 تو کہ نہ کھا۔

اس پاس کے کواڑ اس کی فریسی پر بھرتے لگے۔
 عموماً اس وقت سرگھر نہیں ہوتے لیکن وہ بھی چند
 ایک تھے۔ اس پاس کی گلیوں میں اسے دھو نہ لے لیں
 تھے۔

مور تھیں انھی ہو کے۔ اسے دھو دینے لگیں۔
 کچھ بچے بھاگ کر اس کے گھر پہنچے تھے۔ ان کی
 اطلاع دینے والے تو چند ایک سیانے لڑکے ساتھیوں
 لے کر وہ سرے کھلے کی گلیوں پر پتہ کرنے چلے گئے کہ
 شاید بلی وہاں بیٹھی گواہیاں دیتی ہو۔

اس کے گھر میں ہی ہوتی تو کوئی سا لڑکھو تو نہیں رہ
 (لے) تھی۔ کوئی اور جو پورے گھر میں اس کھلے کی کسی
 دھن لے لی ہو تو وہ بھی فریسی نہ تھیں۔ لیکن اس
 آس پاس۔ ہاں یہی بلی۔ راہ و عمل کے میں ہو
 کھل گئی۔ باہر کوئی مرچا ایک (خدا) کے لیے گیا۔

وہ بھی اپنی اپنی بات کر رہے تھے۔ کئی اور زکیہ کے
 بولنے سے میں اس سے بچوں کے اس کا ہاتھ دھو
 گئی کہ وہ کھانے کی پوری ہو۔ اور اس وقت میں کھانے پر
 تھی ہی دوڑے تھے۔ آسے۔ ایک کھانہ مزہ کھانا
 (بچہ) کو لے کر اپنے گھر میں آئے۔ اسے ایک ایک کھانے
 منہ لٹکائے۔ وہاں لوگ لگے۔ کھانے کی مور تھیں اسے

پچاس نوڑو لوگوں سے لیں۔
 "تک کھلے اور لکھو۔ ہوں کو بارہ۔"
 یہاں بیٹھے دس دن میں ایک کھانہ لیا۔ کھانا ہوتا
 تھا۔ کوئی نہ کوئی کچھ کھانا پھر مسجد میں اعلان ہوا
 سب سائے مل کے دھو نہ لے رہے تھے۔ لیکن ان کے
 واقعہ میں کھینچی اس لیے زیادہ مخصوص ہو رہی تھی کہ
 ایک تو وہ بچے کم عمر ہوتے تھے۔ کوئی دو اعلیٰ سال
 کوئی چار پانچ سال کا۔ سب سے سہ کوئی چھ سال کا
 زیادہ تر تین سال تک کی عمر کے بچے ہوتے۔ وہاں
 کھانے کے شوق میں وہ زمین گلیاں پر سے لکھ جاتے
 اور پھر راستہ بھول جاتے۔ روتے ہوئے بچے کو کوئی نہ
 کوئی اپنے پاس بٹھا کر مسجد میں اعلان کروا دیتا۔
 لوگ کھینچ آگئے لے جاتے۔ یعنی ایک کھانے کے کھار
 اندر ڈرامہ ختم۔

ایک بات وہ سری تھی۔ بلی نو سہل کی تھی۔ بلی
 تھی۔ دن میں کئی بار گھر سے کسی نہ کسی کلام سے
 لکھتی تھی۔ راستہ بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
 تھا۔ اس کھانے کے علاوہ اس پاس کا علاقہ بھی چھوٹا
 کیا تھا۔ اسے جانب ہوئے تھے۔ کھانہ شروع ہو چکا تھا
 اس لیے ہر جانب خوف۔ ہر اس کا عالم تھا۔

"ہائے کوئی فرخ کو بڑا کر لے گا۔ بے خبر کہیں گیندا
 کھیل رہا ہو گا۔ اسے تھوڑا تھوڑی بس نہیں مل رہی۔
 ہائے کوئی بلی کے ابا کو خبر کرو۔" ہائے "ذکیہ
 خوب رہی تھی۔

کچھ دیر تک فرخ بھی آگیا۔ اسے پتہ چلا کہ وہ گھر
 سے بلی لایا ہے۔ اور اب مغرب کا وقت ہو چلا ہے تو وہ
 بھی کھانا کھانے لگے۔

"کیاں جیتی ہو اسے وہ ہر کوڑا ہوں۔"
 وہ تو تو بڑا بچا کر گھر۔ سوالات گھبراہٹ یا اپنے
 باپ کو بڑا کھج کہ کلام دھندہ چھوڑ کے یہاں آجائے
 مجھے دکھانے کے لیے۔ بڑا بڑا مصروف جو سب
 وہاں تھے۔ وہاں تھوڑا سا لالین رہا ہے اب۔ "ہاں کی گفت
 ملا۔ اسے یہ طریقہ کھانے کے لئے بھلا کے منہ لٹکے

اس وقت ایسا ہی طوفانی ہوا تھا پھر کسی کا ہاتھ نہیں
کڑا تھا۔

”کالہ۔ کالہ۔ ہائی ایک۔“
ایک بار بار وہ سارے لڑکوں کو لڑا ہوا اس جانب آیا تو
خندہ کا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

”جلی سے جلی پہنچا جی۔“
”ہائی۔ ہائی۔“ جیل جلی کی ہے۔ ”پھولی
راستوں کے ساتھ وہ ہاتھ میں پلاڑی پھیل اویچی کر کے

گھسے گھسے
”کے اندر پھر سے زندگی جاگ اٹھی۔ وہ دوبارہ
تلی کے پتوں سے نیچے تھی فوراً“ اٹھ

”ہی ہاں“ میری جلی کی ہے۔ گدھر ہے میری بچی“
”میں سے ملی ہے یہ چیل“ ”نئی مڑو آگے بڑھے۔“
”یہ جلی کی دکان کے آگے پڑی ہوئی تھی۔“

”جلی کی دکان۔ وہ تو بند ہے۔“
”ہی کمر میں کمر کی نماز پڑھ کے لوٹ رہا تھا تو میں

”اس کی دکان کھلی دیکھی تھی۔“ ”کی اور نے گواہی
دلی میں پر سب اس جانب بھاگے۔ آگے آگے خست
دغضب سے بھرا رخ تھا۔ ذکیہ کو عورتوں نے بہت

مشکل سے پکڑ کے جانے سے روکا تھا۔
”دھن کا شہر بند تھا۔ پتھر مار کے تلا توڑا گیا۔ شہر

اٹنے ہی زمین پر سیاہ کالج کے ٹکڑے نظر آئے
”جس پر جی کی درگاہ سے لے کر ذکیہ نے پیچھے بیٹھی
خو کے لڑ۔ جلی کی کلائی میں چڑھائے تھے یہ اسی

کے خواب تھے۔
”خواب“ ”خواب“ میں کڑے کا ٹکڑا لے کر

”جی کی توڑا اس نیم تاریک غالی دکان میں گونی کے
لوڈ کی جلی کو بک رہا۔ جسی کے باب روٹھ گیا۔

”شکوہ“ ”پھی درمی جس پر۔“
”کے کچھ لڑکے تھے۔“ ”تھی سہی جی اتار اور
لڑائی کی ماریں اتار دئی تھیں۔ جسی کی آواز کے اوپر

”تین فلمیں رکھی تھیں۔“
”پہلی پہلی ہے۔“ ”ایک فلمیں سے دو قدم آگے
پہرے کے۔ سنو کر تھیل کے۔ سری طرف بھاگ کے کہا

”تھا۔“
”کمر کی توڑا پہلی پہلی ہی تھی۔ بے پروا میں
ذہنی ہوئی۔ وہ وہیں پتھرا ہوا تھا۔ اس طرف آئے

”فرخ کو اس نے۔ وہ نول بالادوں سے پکڑ کے آگے
سے دو گئے کی کوشش کی۔ شاید وہ نہیں چاہتا کہ فرخ“
”جلی کو دیکھے لیکن وہ اس شخص کو دھکا دے کر آگے بڑھے

”گیا۔“
”سائے زمین پر اونٹنی گری۔“ ”جلی ہی تھی کہ
مری نہیں تھی صرف بے ہوش تھی۔“

”وہ تو لاش نہیں تھی کمر اس پر ایک نظر ڈالتے ہی
اس کا پندرہ سالہ بھائی کمرے کمرے ایک لاش میں
تبدیل ہو گیا۔“



”ان کے محلے میں یہ سلاوا واقع تھا۔“
”جس پر گھر میں افسوس اور غم کا اظہار ہو رہا تھا“
”وہاں خوف بھی پھیل گیا تھا۔ اگلے ہی دن تک لوگوں

”نے اپنی بچیوں کو گھر سے باہر تو لیا محسن میں بھی قدم نہ
رکنے دیا۔ البتہ خود و حقوق درہوق عابد چوہدری کے گھر
جا رہے تھے۔“

”جانے کی ایک نہیں تین وجوہات تھیں۔“
”ان چاروں دلوں میں اس گھر اپنے کیا کیا کچھ نہ لڑ رہا
تھا۔ ان کی سب سے پھولی جلی کو سہی کی معصوم پہلی

”کسی درندے کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد تازہ
حالت میں ہسپتال میں داخل تھی۔“

”ان کا جوں سلا مینا۔ فرخ۔ جس نے ابھی
جوانی کی پہلی بہار بھی دھنک سے نہ دیکھی تھی اپنی

”بہن کو اس کو بھائی حالت میں دیکھنے کے بعد اپنے
ہوش و خواہش کھو بیٹھا تھا اور جھپٹیں مارا وہاں سے
بھاگ کر آ رہا تھا۔ ایک آواز نے اس کے پیچھے لپک لپکا

”تھا کمر جلی کی حالت زیادہ توجہ طلب تھی۔ اسے فوری

طبی اہل لای سخت ضرورت تھی۔ وہ سب فریادوں کو اس کے محل پہ چھوڑے ہوئے ایک کمرہ کی صورت میں بجلی کو ہسپتال لے گئے۔ دوسری طرف ہم وہیں سے بے قابو ہو کر فریادیں جاری کی۔ کمرہ کا قہقہہ لگتی ہوئی تھی۔ ہم بھی تھی کہ شام سے بجلی کی دھندلاہٹ میں بے قراری تھی۔ ہم نے نہیں تھا کہ مجھے والے اس تک پہنچے ہیں۔ اس کے منی سیرا گھر سے اسے نیم مرہ حالت میں اغوا لے کر۔ اپنی تین توہ اور اس کا وہ اسے مرہ کچھ کے چھوڑ دیا۔ اس کے کمرے کے کمرے میں غاموشی سے اس کی لاش ٹھکانے لگا دی۔ اسے اب تو اس نے پورے علاقے کے لوگوں کو بجلی کی خوش میں سرگرداں رکھا تو یہ اس ہو کر بھاگنے کی تیاری پکڑی مگر اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل پاتا فریخ نے اسے جا لیا اور دھشتانہ طریقے سے اس کا سر پتھر کے ستون سے ٹکرا کر اسے قتل کر ڈالا۔

ضعیف وادی جو پہلے ہی پوتی کے ساتھ گزرنے والے ملتے اور خاندان کی ہونے والی بدنامی پہ صدے سے نہ حال تھی اس غم کو بداشت نہ کر پائی اور اس کے گھر پر ہر روز ہر تکلیف سے توجہ پائی۔

ذکر اور اس کے دیگر قریبی رشتے دار جو چھپے تین دھول سے اس شش و پنج میں گرفتار تھے کہ علیہ چودھری کو کیت سے کیا کہہ کر ملو اسے کیا کہ۔

تمہاری ٹمن بنی کسی کی دھندلی کی جینیت چڑھ گئی۔

یا اس بات کی کہ تمہارا اکلوتا بیٹا قتل کے جرم میں سزا دیں گے پیچھے ہے اور اپنا دماغی توازن تقویٰ کھو بیٹا ایک

اسبان کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ علیہ چودھری کو اس کی دھندلی کی خبر سے کھولیں آگے بڑھ کر گئے تھے۔

علیہ چودھری ایک شریف النفس سید صاحب زادہ تھے انسان تھا۔ اپنی ماں سے بے حد محبت رکھنے والا بننا۔ ایک شوقیہ علیہ اور ایک نرم زبان شوہر جس

نے اپنی ان پڑھ قدر سے امید اور سید و قواس کی بیوی کے ساتھ بھی صبر کے ساتھ رہ کر لیا۔ ملا لکھ لکھ لکھ لکھ ہوئے مزاج کا مناسب حد تک تعلیم یافتہ انسان تھا اور اپنی لوار کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا مگر اس کی تعلیم تو ایک طرف روزگار کے پائرس وہ ان کی اسیت سے حسب خواہش نہ کر سکا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کے کونیت میں مہم ہونے سے اس کے لیے پ کی افی برے اثرات مرتب ہوئے تھے۔

اچھے تہ کہ خوشحالی آگئی تھی۔ اگرچہ بہت فخر نہیں آتی تھی کیونکہ اپنی بیوی کے پھر بہترین اور شہ خیرتی سے وائف ہونے کی وجہ سے وہ اسے اس انتہی خرچہ بھیجتا تھا جس سے وہ کمر کو کھلے ہاتھ سے چاہ سکتے باقی کی بچت اور مستقبل کے لیے سربلہ کاری خود کر رہا تھا اور اس میں خاصا کامیاب بھی تھا۔

برے اثرات یہ تھے کہ حصول رزق کے لیے ہر ملک مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بچوں کو اپنے سائے پروان چڑھتے نہ دیکھ سکا نہ ہی انہیں اپنے خوابوں کے مطابق پال سکا۔ اعلیٰ تعلیم تو ایک طرف اس کی لوار مزارے لائق تعلیم بھی حاصل نہ کر سکی۔ بیٹی بھی تو ذکیہ نے شوہر کے جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد اسکول سے اٹھالیا۔ فرخ بھی اسکول کی تعلیم مکمل نہ کر سکا چھوٹی دونوں بچیاں ذہین تھیں اور ابتدائی جماعتوں میں تھیں لیکن گھر میں کوئی ان کے اس شوق کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں تھا اس لیے اسے ان دونوں سے بھی خاص امیدیں نہ تھیں۔

ان دونوں دن رات کی اٹھک محنت وہ اس نیت سے کر رہا تھا کہ اس کی بارہوا کا ستن جائے تو بچوں کو اس سے بڑے۔ وہیں کاروبار بجائے اور ہائی کی زندگی کی بچوں کے ساتھ چین و سکون سے بسر کرے۔ اسی خواب کی تکمیل کے لیے وہ اپنے خون پیسے کی مکمل تلاش کر رہا تھا۔ رات کی وفات کی اچانک خبر اس کے لیے دھچکے کا باعث تھی۔ اس کا دل پردیس سے اور بھی اچانک ہو گیا جس کی وجہ سے وہاں کے آخری دنوں

میں اس کی خدمت کر کے جنت کا طلب گار بھی نہ بن
 سکا ایک انسان جو بھی تھا کہ اب اس کی وہی لور
 میں ہے بغیر کسی درد و غم کے سانس کے اکیلے ہیں اس
 لفظ کے بار بار اس نے اپنا کام سمیٹا اور بیٹھ بیٹھ کے
 لپکا کرتا تھا۔

میں نے اسے علم ہوا کہ اس کا یہ فیصلہ بروقت
 نہیں تھا۔ قیامت تو آگئی تھی اور ستم یہ کہ آگے
 مڑ رہی بھی نہیں۔ یہ قیامت اس کے خاندان پر ٹھہر
 چکی تھی اور نجانے اسے کتنے عرصے تک اس خاندان
 سے رہنا تھا۔



وہ یہ سب ہرگز ہرگز یاد نہیں کرتا چاہتی تھی۔
 مگر وہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے
 سب کچھ۔

وہ بین ذاتی عورت تھی۔

ہوش میں آتے ہی وہ یہ بین سختی۔ سوتی ہوئی
 آنکھیں ہنسنے لگیں۔ کئی ماٹوس مہین چہرے کو
 حاش کرتا چاہتی مگر اس کے ارد گرد کئی انجان چہرے
 ہوتے۔

مجنس سوال۔ ترجمہ بھرے ہر طرح کے چہرے
 والے گا۔ نرس گا۔ پریس والے گا۔ یا پھر کسی محلے
 دار یا عزیز کا۔

میں کا چہرہ نظروں آگاہ اس کے صرف بین ستائی
 رہتے۔ وہ یہ بین خیرت سے سختی جو بہت جانے پہچانے
 تھے۔ لیکن یہ بہت دور رہنے کے بعد اسے یاد آتا تھا
 کہ اس نے کبھی اس کی طرح میں بھی تھا۔

کیا میں؟

یاد آئے۔ اسے اپنے ذہن پر زیادہ غور نہ
 کیا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ مجھیں اس کی اپنی تھی۔
 اس کے ساتھ ہی ایک بد بھلا چہرہ بھی یاد آئے
 کہ اسے یاد آ گیا کہ اسے اپنے ہاتھ پر نرسوں سے

میں اس کی خدمت کر کے جنت کا طلب گار بھی نہ بن سکا ایک انسان جو بھی تھا کہ اب اس کی وہی لور میں ہے بغیر کسی درد و غم کے سانس کے اکیلے ہیں اس لفظ کے بار بار اس نے اپنا کام سمیٹا اور بیٹھ بیٹھ کے لپکا کرتا تھا۔ میں نے اسے علم ہوا کہ اس کا یہ فیصلہ بروقت نہیں تھا۔ قیامت تو آگئی تھی اور ستم یہ کہ آگے مڑ رہی بھی نہیں۔ یہ قیامت اس کے خاندان پر ٹھہر چکی تھی اور نجانے اسے کتنے عرصے تک اس خاندان سے رہنا تھا۔ وہ یہ سب ہرگز ہرگز یاد نہیں کرتا چاہتی تھی۔ مگر وہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب کچھ۔ وہ بین ذاتی عورت تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ یہ بین سختی۔ سوتی ہوئی آنکھیں ہنسنے لگیں۔ کئی ماٹوس مہین چہرے کو حاش کرتا چاہتی مگر اس کے ارد گرد کئی انجان چہرے ہوتے۔ مجنس سوال۔ ترجمہ بھرے ہر طرح کے چہرے والے گا۔ نرس گا۔ پریس والے گا۔ یا پھر کسی محلے دار یا عزیز کا۔ میں کا چہرہ نظروں آگاہ اس کے صرف بین ستائی رہتے۔ وہ یہ بین خیرت سے سختی جو بہت جانے پہچانے تھے۔ لیکن یہ بہت دور رہنے کے بعد اسے یاد آتا تھا کہ اس نے کبھی اس کی طرح میں بھی تھا۔ کیا میں؟ یاد آئے۔ اسے اپنے ذہن پر زیادہ غور نہ کیا۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ مجھیں اس کی اپنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بد بھلا چہرہ بھی یاد آئے کہ اسے یاد آ گیا کہ اسے اپنے ہاتھ پر نرسوں سے

”چھوڑ دو مجھے۔ ائی۔ ائی۔ مجھے چھوڑ دو۔“

دادی۔ نہیں۔ چھوڑو۔ اللہ میاں کی۔“
آخری نام لڑکے کا تھا جو ان شیطانوں کو تاکو اور گزروا۔
پھر کڑا ٹھوس کے اس کامز بند کر دیا تھا۔

اسپتال کے بیڈ پر بیٹھتے تھے اسے اپنا سانس بند
ہو جاتا تھا۔ اس نے پورا مہر کھول کے سانس
لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایسا کرتے سکی تھی۔

اور تھ۔ اُن کتنے سالوں بعد پھر اس کا دم گھٹ
رہا تھا۔ وہ مرنے کو تیار تھی۔ کچھ کھانا چاہتی تھی۔
اس نے دھمے باتوں والی مورت کو جو اس کی مہل میں اور

اس کے سر والے کھنڈے کو جو اس کا باپ تھا۔ انہیں پیچ
پھینک کے پکارنا چاہتی تھی مگر اُن پھر اس کی تو از بند تھی۔
وہی کھنڈے۔ وہی دہ۔ وہی بے بسی۔ وہی

مین۔ وہ اپنی تجسس پتھوں کا جھگڑا۔
سویرا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لہرا
کے گرنے لگی اور اس کے گرد کھڑی پانچوں لڑکیوں میں

سے صرف ایک کے ہاتھ اسے سنبھالنے کے لیے
آگے بڑھے تھے۔
یہ ہاتھ اس کی عزیز از جان دوست بینش کا نہیں

تھا جو اس سے دوستی اور غلوں کا دم بھرتی تھی۔ وہ
پچھلے چرا کے اپنے ہاتھ سینے دو قدم پیچھے ہٹ گئی
تھی۔

یہ ہاتھ اس کی گزروا مہر اور روشی کے بھی نہیں
تھے جن کے ساتھ اس کا لکھن لڑا تھا۔
یہ ہاتھ اس کی مین سیرا کے تھے جو اس کے نم بے

بے ہوش و نوک و بانسوں میں بھرے ہلکے ہلکے کے دوری
تھے۔ اس کے پاس اس کی سہیلی تھی جو اس کے گھر کی
لکھن کے مہل پہنچا پائی تھی۔ یہ سہیلی اس کے خوف سے

اس کے اندر ہی جم جاتی تھی۔ وہ خود کو گھر کے
گھر کی لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ
لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ

لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ
لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ
لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ لکھن کے ساتھ

پہلے اس نے اپنے اندر تار لیے تھے۔
عابد چودھری اور دیگر۔ تو کچھ کھنے کے قتل عہد
رہے تھے۔ البتہ سورا کے ماموں اور غلوں کے

بڑے کے لڑکے والوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے
تھے۔
”دیکھیں آپ اس طرح واپس مت جائیے۔ ان

سے یہ غلطی ضرور ہوگی کہ آپ سے یہ بات چھپائی
جائے۔“
”تو کیا اشتہار لگواتے؟ عجیب بات کر رہے ہیں

صاحب آپ۔“ لڑکے والوں کی جانب سے کوئی بڑا کر
بولے۔
”بنا بھی دیتے تو کیا ہو جاتا۔ آنکھوں دیکھی کمی

کون لگاتا ہے۔ کوئی اور بولے۔
”نہیں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی چودھری
صاحب کو یہ باتیں پہلے کر لینی چاہیے تھیں۔“ تسلیم

پتھم نے کہا۔
”تو سب کچھ جان کر تم اپنے بیٹے کا رشتہ بدل
کر لیتیں؟“ ان کے شوہر پر تو اڑنے تاکواری سے

پوچھا۔
”یہ نہیں۔ تب بھی ہماری جانب سے انکار ہی ہوتا
لیکن کم از کم عزت تو رہ جاتی ان کی بھی اور ہماری بھی۔“

کم از کم یہ لڑکائی تو نہ لگے۔ قاضی صاحب بھی دکان کے
لے آئے ہیں اور انہیں واپس لوٹنا پڑا ہے۔“
انہوں نے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اپنے بیٹے

شہناز کو دیکھا جو اپنے کیا اور نکلیں گھوڑا بھی
اچھی کیا تھا اور ماتھے پر تل لے کر کسی عزیز سے ملنے
تفصیل سے سن رہا تھا۔ وہاں ہونے کے ساتھ یہ جانتی

تھی کہ کھانسی کے بیٹے کا دم گھٹ گیا ہو گا۔
”پلیس ابو جان۔ واپس چلیں۔“ بلکہ مجھے جرت
اچھی ہے کہ آپ اب تک یہاں کھڑے ہیں

”ابھی ابھی۔“
”ابھی ابھی۔“
”ابھی ابھی۔“

”ابھی ابھی۔“
”ابھی ابھی۔“
”ابھی ابھی۔“

کی کہ شش کی تو اس نے پلٹ کر اسے لوک دیا۔

ہوں۔" بے بسی سے اس نے سچا اور زندگی میں باقی
چاروں لڑکیوں کو اپنے "لاڑی" ہونے پر افسوس ہوا اور جو
بیش نور کو سبب بازگشت میں شمار کیے جانے پر فخر
محسوس کرتی تھی۔

"لاڑی میں لڑکا ہوتی۔ جب ان سب دورہ لوگوں کے
ساتھ واپس جانے کے بجائے میں فخر سے آگے پیچھے
کے خود کو پیش کر سکتی تھی۔ اب کبھی آنکھوں میں
زندگی کی رشتہ واپس لاسکتی تھی مگر کاش۔ کاش
میں۔"

"مجھے۔ مجھے سب افسوس ہے۔"

اس نے فی الحال وہی کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ وہ سویرا
کی والدہ ذکیہ کے سامنے کھڑی بچے دل سے اظہار
افسوس کر رہی تھی۔

نونا۔ وہ ایک سرور تو بھرتے ہوئے اٹھ گئیں۔
روم صحنہ نے ان کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں وہ
تھکے تھکے قدموں سے اپنے بے ہوش بیٹی کی جانب بڑھ
رہی تھیں۔



شاید اسے اندازہ تھا کہ حق نواز کیا کہنے والا ہے اور
حق نواز۔ جو اس ساری صورت حال پر غور ان کو واقعی
درستی قرار دے گا کہ جتنی سبب البتہ وہ سہول کی طرح
میش میں آنے کے بجائے وہ اندر ہی اندر شرمندگی
محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ جو پہلے ہی اس دکھ کی وجہ
سے گئے ہوئے ہیں دنیا کی انکھوں میں گرے ہوئے
چہرے کے چہرے لوگوں کو آن لڑائی کے لیے ایک
اور تو کمر نہ مارنا پڑے گا۔

پہلی صاحب! آپ بھی بہن بیٹی دایلی ہیں۔ لیوں
اس میں تو اپنی مت جا میں۔ اس میں بچی پہلے پارتی لایا گیا
قصور ہے تو وہ معصوم اور پاک ہے۔"
سارے کے باروں نے آخری کو شش کے طور پر ان
سے التجائی۔

"بے شک آپ کی بچی بے قصور ہوگی مگر ہمارا کیا
قصور ہے جو ہم مفت کی بدنامی مول لیں اور ہمارے
بیٹے کا کیا قصور ہے جو اس کے جسم میں بیوی کی بجائے
غری بات آئے۔" رب نواز صاحب نے اپنے ہمراہ
آنے لوگوں کو روکا جی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دور بھائی صاحب! پرامت مانیں۔" تنہیم بیگم
نے بھی ملنے ملنے کہا اپنا فرض جاننا۔ "جی بچی کو معصوم
اور بے قصور آپ بے شک کہہ لیں لیکن پاک تو نہ
ہیں۔ یہ تو آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات
ہوئی۔ ایسی ہی بات ہوتی تو خاندان والے جو بھروسے
میں بیٹھیں کر رہے ہیں وہ خود نوہیہ کے لے گئے
ہوئے۔"

وہ ایک ایک کر کے رخصت ہوئے گئے۔

نونا نے ایک ایک کر کے رخصت ہوئے گئے۔

نونا نے ایک ایک کر کے رخصت ہوئے گئے۔

سویرا اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے کچھ دیر
قبل اسے سیلیوں اور بہنوں کے جھرمٹ میں بڑے
چھاؤ کے ساتھ باہر لے جایا گیا تھا۔ اس منٹ پہلے وہ اپنی
مال اور بہن کے سارے خود کو سمجھتی ہوئی اس کمرے
میں لائی تھی۔ وہ اس کو بیٹھنے پر لٹاکے "اس کے غریب
ہاتھ پر سناٹے کے بعد اٹھی ابھی باہر آئی تھی۔"

"میں۔ ذرا انتظار کیا تو کون بھولے۔" ذکیہ نے
نیچی نظروں اور دھیمی آواز کے ساتھ وہاں سے اٹھتے
ہوئے کہا تھا۔ انہیں فرش پر اپنی بے نیاز آنکھیں
گاڑے بیٹھی "اپنی بیٹی کی خاموشی سے غول محسوس

ہو رہا تھا۔
میں سویرا گرم کر کے لاتی ہوں تمہارے لیے۔"
سیدائے بھی اٹھتے ہوئے کہا اور ایک بی کے لیے رک
کے اس کے سفید چہرے کی جانب دیکھا۔ کہ شاید
وہ کچھ کے اور کچھ نہیں تو وہ لانے سے معذرت

ہے جو ہر سال اپنے چھٹا سالہ والے کو "اکھن" جان کے اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں "ڈکیر"! تمہاری حاجت بالندیشی نے کن یہ دلدار دکھایا ہے کہ میری معصوم تو سارا کی پکی اپنی ذات پہ بھی نہ مٹنے والا داغ لے لے لے لے کے چھینے دے میں بجز سوں کی طرح منہ پھیپھائے بیٹھی ہے جب تو میری رات کو غصہ میں ار کے جب وہ جیتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارا گناہ دیا دوں۔ جب میرا بچہ میرا ماں بپس نے میرا بازو بٹھا تھا اسے میں سلاخوں کے پیچھے دھکا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے اپنا سر اس سلاخوں سے لٹکا کر اے خود کو لٹھم لٹھم کر لوں۔

آسمانے اختیار ان کا چہرہ جھکونے لگے تھے۔ "آج کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی جب لوگ میرے گھر آتے ہیں انہوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بلی کو دیکھتے ہیں مجھ سے ہم ردی بناتے ہیں تو اپنے سب بچوں کو لے کر میاں سے بھاگ جاتے کوئی چاہتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے ہم یہ شہر چھوڑیں گے۔ یہاں رہے تو اس چھوٹے شہر میں یہ واقعہ کبھی پرانا نہیں ہو گا۔ بلی کبھی بھی رات کو ڈرناؤنے خواب دیکھنا نہیں چھوڑے گی۔ ہم لاہور چلے جاتے ہیں یا کسی بھی اور بڑے شہر میں جہاں لاٹھوں لوگوں کے جھوم میں ہمارا وجود کم ہو جائے کوئی ہمیں پہچان نہ سکے۔"

انہوں نے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ سنایا تھا۔

عابد چودھری کا بھائی تو کوئی تھا نہیں باپ عرصہ ہوا گزر چکے تھے اب میں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک کن جی ہاں۔ جس نے بلی کے ساتھ ہوئے واسطے ہمارے محل کی لاکھڑاں بند خانے کی بجائے خیر اکی اپنے بیٹے کے ساتھ نکلتی توڑے اس کی اور بھی کچھ توڑے کے رکھ دیں سلاخوں چودھری نے ان سلاخوں کی بوقت حلق کر لیا۔ سو اب اس شہر میں اس کے لیے کچھ نہیں

دو مری طرف ڈکیر کو بھی شوہر کا یہ فیصلہ درست

پھر وہ لاہور چلے آئے عابد چودھری نے ہاں محنت کر کے جمع کیے ہوئے سہائے سے لاہور شہر آ کیا وہ جلد ہی ہم ٹیکہ تو ختمی بیٹے سے چار کچھ کچھ سمیر اور سویرا کو اپنے اسکولوں میں داخل کر دیا۔ اکیہ بھی اس حادثے کے بعد غصہ میں چل پڑی تھی۔ اب وہ ایک سلیبی ہوئی اور ذمہ دار عقلمند بنے۔ روپ میں داخل ہوئی تھی۔ کچھ کاموں اس سب سے کے بعد میسر دل کا تھا۔ عابد صاحب تو تھے ہی انہوں پر تیز گاہ ڈکیر کی توجہ بھی باقاعدہ اور سیدہ خود ہونے لگے شیاں بہار ہو رہیں۔ میرا سنا تھا کہ کتنے۔ اور سویرا نے نجات کا باعث سمجھتے ہوئے پردے کو اپنا لیا۔

پرانے محلے میں ہر نظر اسے اپنا جسم چرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظموں سے ڈرنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے شہر میں آنے کے بعد انہوں لوگوں سے بھی وہ گھبرانے اور چھپنے لگتی۔ بارہ سال کی ہی عمر میں ماں نے چادر اوڑھنا کے اسکول بھیجا تو اسے لگا جیسے اس کے گرد ایک حصار قائم ہو گیا ہو اور اس نے اس تحفظ کو مقبولی سے تمام لیا۔

اور پھر ستر چوبیس سال تک آتے آتے وہ اس بدلتے سے باخبر ہو چکی تھی کہ وہ کیا کھو چکی ہے اس میں اور اس کی دوسری ہم عمر لڑکیوں میں کیا فرق ہے۔ محلے تو برس کی عمر میں وہ نہ صرف اپنے بچپن کی معصومیت بلکہ لڑکپن کا الزون اور بے غمگی۔ اور بھائی کی امنگ۔ سب کچھ گنوا چکی ہے۔ وہ اسی عمر میں اس حقیقتوں سے زبردستی روشناس کرادی تھی کہ جب وہ مری ٹریکس گڈی گڈی گڈے کا بیار چاری ہوئی تھی۔ اسے اپنا آپ دو سری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جسے سب سے کم محسوس ہوتا تھا "اسی لیے وہ کسی کے قریب بھی نہ آسکی تھی۔ سوائے بیٹن کے

"اور اب تم بھی چاری ہو"

وہ اپنے اسے اللہ ڈاکٹر کے آنکھیں سونہ لگا

ہو جاتی تھی اب اس کمرے میں پہلے کی طرح سوائے
اس کی اسی کے نور کوئی نہیں آئے گا۔ ٹراٹھے ہی میں
ایک ٹیبلٹ نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔
اور اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ ہی کھل گئیں۔
اس بار اندر آنے والے عابد چودھری تھے۔
وہ اندر ہی اندر لڑا خمی۔

”اس کے لب آہستی سے بے اثر کواڑ
اندھری ام توڑی۔ عابد چودھری دروازے کے پاس
کھڑے جیسے سوچ رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں آئے
ہیں۔“

سہرا اپنے باپ کی خاموشی کی علوی ہو گئی تھی۔
”جیہے خاموشی۔ یہ کریند۔ اسے کبھی کبھار بری
طرح ٹھٹھا تھا۔ لیکن وہ اس پر حیرت زدہ ہوتا۔ چوڑھری
تھی۔ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی مگر آج اسے اپنے
باپ کے رویے میں کچھ غیر معمولی پن نظر آ رہا تھا۔
اسے فوف محسوس ہونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ
اپنے باپ سے ڈرنے لگی۔“

”لیکن میں اس نے مال پور دہلی سے سنا تھا کہ وہ
اپنے باپ کی موت اڑلی بنی ہے۔ مگر ہوش سنبھالنے کے
بعد جب اس نے انہیں واپس پاکستان میں اپنے پاس
یا توپوش اپنے آپ سے دور اور لاہلق۔ اسے یاد
میں تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اسے گود میں لیا ہوا
میر پور سے ہاتھ پیر کے اس کی کوئی فرمائش سنی
ہے۔ لیکن اب ہونے کے ناتے انہوں نے اپنے ساری
فراموشیوں سے اسے ہر آسائش ہر سولت مہیا
کی۔ اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کیے۔ اس کے دینی
دوران کو دیکھتے ہوئے اسے قرآن حفظ کرایا۔ اب ایک
نئے حوالے میں یاد رہے تھے پورانی شکل و شوکت
سہرا۔ اس سے بے اندازہ تو ہوا تھا کہ انہیں سویرا
سے لڑتے برعلی نہیں تھی۔ یہ اچھا دن بہت تھی
کہ اس کی سہیلی۔“

”اب تو وہ دہلا رہے تھے۔ خود کو نہیں دے ساری تھی۔
تو اس کا کہہ دینا تھا کہ اسے محسوس کر کے اس کی
کمرے سے نفیقت ہائی سے سوچا۔“

تو جب میں نے ان کو دیکھا ہی کیا ہے سوائے فوف اور
بد حالی کے ان کی ہر ہر حرکت انہوں کے لیکن خراب کی
صورت ان کی پیشانی پر اس قدر واضح نہیں بننے کہ
میری ذات کے حوالے سے ملنے والے نظرات کے
عکس۔ انہیں مجھ سے تنگ آنا ہی تھا۔ آکر وہ مجھے
زہر دے کر مارنے کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں تو
لطف نہیں۔“

”ابو جی۔“ بھانے کتے عرصے بعد اس نے انہیں
مناظرہ کیا۔ یہ مدت وہ بہت مشکل سے مجتمع کیا
تھی۔ اس پکار پر بھی عابد چودھری نے نظر اٹھا کے
سامنے نہ بھلا۔

”ابو جی! آپ میرے سامنے مت کیا کریں۔
جیہے ان مت ہوں ابو جی۔ اس ٹھیک کہہ رہی ہوں۔
بھنا مشکل آپ کے لیے میرا سامنا کرنا ہے۔ اتنا ہی
تکلیف دہ میرے لیے آپ کو یوں دیکھنا ہے۔ باپ بنی
کے سامنے سر اٹھا کے آئے تو ہی اچھا لگتا ہے میں
جانتی ہوں آپ کبھی میرے سامنے سر اٹھائیں
کے نہیں آسکتے۔ میں جانتی ہوں میں ان بیٹیوں میں
سے نہیں جن کو دیکھ کر باپ کا سینہ محسوس ہو
آنکھیں غور سے چمک اٹھتی ہیں۔ میں جانتی ہوں
مجھے دیکھ کر کبھی بھی آپ کو فخر کا احساس نہیں ہو سکتا۔
میں۔ میں بد نصیب اس دنیا میں آپ کا سر جھکانے
آئی ہوں۔ آپ مت آیا جیسے میرے سامنے۔ کم از
کم آپ کو اس طرح سر تو نہیں جھکا کر بڑے لگ
موت مرے گناہ گار ہی نہیں ہونا چاہی۔ درت میں خود
بیش ہوش کے لیے آپ سے دور ہو جاتی۔“

”بلی!“ عابد چودھری تڑپ کے آگے بڑھے۔
”ابو جی۔“ کوئی بنی اپنے باپ کی شرمسار نظریں
دھکے ہوئے شانے نور جھکا ہوا سر نہیں دیکھ سکتی۔
مجھے بتا دیجئے ابو جی! خود کشی کے علاوہ کوئی اور راستہ
ہو جائے جس سے میں آپ کی ذات کا اور سلمان نہ پیدا
کر سکوں۔ مجھے بتائے ابو جی۔“ وہ ہلک اٹھی۔
”بلی۔“ اچھی تھی۔ کس نے کہا کہ تو اس دنیا میں
موت لینے کی ذات لے کر آئی ہے۔ اور دیکھ۔ میرا

میں نے ایک سی جھلک دیکھی ہے مگر اس کا چہرہ بھلا نہیں پارتی۔ میں اس کی ہم صنف ہونے کے لئے اس کی آیت کو بخوبی محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت قند ہوا۔ اس کے ساتھ بھی۔ اور اس کے گد و اہل کے ساتھ بھی۔ پر سوں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کسی بھی طرح اس سے کم نہیں کہلایا جا سکتا مگر یہاں وہی پہلے ہوا تھا۔ وہ دوبارہ بخوش ہوتی ہے حق نواز۔
 روئے صدمہ کے نتیجے میں دردی درو تھا۔
 "مگر اب کیا کیا ہو سکتا ہے۔"

"اچھی نہیں گفتیں تمہارے منہ سے ایسی جھمی ہوئی باتیں۔" اس نے نرمی نظر سے اسے دیکھا۔
 "عجب بے حس انسان ہو تم۔ تمہیں درد احساس نہیں کہ تم لوگوں کی کم ظرفی کی وجہ سے ایک لڑکی کی پوری زندگی تباہ ہو گئی۔ جو بات چار لوگ جانتے تھے تمہاری ایک رشتہ دار خاتون نے چار سو کو گول کے درمیان بتادی اور یہ چار سو لوگ اب تک چار ہزار افراد تک یہ اطلاع سنا۔ تمک مرچ کے بیان کر چکے ہوں گے۔ اس سوچ اس کا قصور ہی کیا ہے۔ وہ کوئی بد کردار بد چلن تو اور لڑکی کیسے ہے جس کے بارے میں کوئی انکشاف تمہارے بھائی کو اشتعل کر گیا ہو۔ ایسا ہونا تو وہ اسے فکرا نے میں حق بجانب ہوتے۔ وہ ایک سیدھی سادی 'شریف اور مظلوم لڑکی ہے۔ تمہارے بھائی اسے اپنا کر نہ صرف ایک مشکل قائم کر سکتے تھے بلکہ ثواب بھی کما سکتے تھے۔"

"کر سکتے تھے نا۔ اب تو نہیں کر سکتے۔ نہ ہی کر رہی گے مجھے اس لڑکی کی معصومیت اور پاک دینی پر ہرگز ہرگز کوئی شبہ نہیں۔ مجھے اس کے ساتھ ہونے والے معاملے پہ جتنا افسوس ہے اس سے زیادہ اپنے بھائی اور والدین کے بد صورت رویہ پہ۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شہ نواز بھائی اپنے دل کو وسیع کر لیتے۔ اس لڑکی کو عزت دے کر اپنا لیتے۔ کسی کی دعا میں ہی ہمیں ہمارے پورے خاندان کو بچا رہا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا میں اس پر پورا نہیں کر سکتا۔"

سرد فخر سے چہرہ نہیں دیکھا ہوا تیری محبت سے بھرا ہوا تو ہے میری نظروں کے سامنے ہے جھلک ضرور جاتی ہے۔ مگر اس احساس سے کہ میں باپ ہو کے تجھے کے کچھ نہیں کر سکتا اپنی مجبوری اپنی بے بسی مجھے شرمسار رکھتی ہے تو نے کیا کیا ہے بھلا۔
 انہوں نے اپنی بیٹی کی شرافت پر شمالی چوہن ہنسی انہیں سے ان کی منک پھوٹ رہی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو میں نے انہیں سمجھائے کی کوشش نہیں کی ہو گی؟"
 حق نواز نے روئے صدمہ کو ناراضی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف میرے سمجھانے بھانے پہ حق نواز بھائی پارات لے جائے پتیار ہو جائیں گے؟ ایسا تو کبھی نہیں کریں گے میں جانتا ہوں انہیں۔"

"میں انہیں نہیں جانتی۔" روئے صدمہ نے شانے اچکاتے میں صرف نہیں جانتی ہوں اور جتنا بھی جانتی ہوں اس کے بعد مجھے یہ بات بہتم نہیں ہو رہی کہ تم بھی اپنے گھر والوں کا ساتھ دو گے۔
 "میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ تم بات کو سمجھ کیوں نہیں رہیں۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا۔ لیکن میں انہیں اپنا ہم خیال بھی نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ بڑے بھائی ہیں میرے زبردستی کیسے میں ان کا نکاح پر مجبور ہوں اس لڑکی کے ساتھ۔ اور پھر انہیں ان کی اپنی مرضی کے مطابق کر کے رکھ دوں گی۔
 اب اس بات پہ متفکر ہیں کہ لڑکی بے چاری ہے تصور ہے اور غلامی جی میں لڑکی ہے۔ اس کے اوپر اس کے اوپر اس کے والدین کے ساتھ تو ایسی ہے۔ حکمت خالص یہی بات اپنے میں جا کے آرام سے ہلا دیتیں تو یہی تو میں سوچ رہی ہوں حق نواز اس لڑکی کی

”ایسی تھالی رو میٹھا۔ اور یہ نکل کر نہ ہوا ہے
مجھ سے جس کا ازالہ مجھے فرض ہو گیا۔ سنا کہ میری
فیلی نے اس کے ساتھ مجھ اچھا نہیں کیا۔ مگر میرا اس
میں کوئی دلی نہیں۔ نہ ہی میں اپنی ذات کے
حوالے سے کوئی اندامت محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں
مجھے یہ مشورہ دینے سے پہلے اتنا سوچنا چاہیے تھا
کہ۔ کہ۔ کہ۔“

جیہات وہ کہنے جا رہا تھا۔ سے کہنے کی خواہش عرصے
سے تھی۔ مگر فی الحال نہ تو موقع تھی۔ تھا اور نہ
ہی اس کا مزہ ایسا تھا کہ وہ یہ بات اچھے و خشک یا الفاظ
میں کہہ پاتا۔ اس لیے کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر تم۔ حق نواز۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ چنڈ سم
ایچھے خاندان کے چشم و چراغ۔ مشہور صحافی اور
سورج جیسی لڑکی سے شادی کرو گے۔ جس کی رسوائی
پورے شہر میں پھیل چکی ہے۔ جس کی شادی ہوتے
ہوئے ٹوٹ جاتی ہے اور کسی زمانے میں جس کے ساتھ
گزر رہے والے سائے کی خبریں اخباروں کی زینت ہوا
کرتی تھیں۔ واقعی ایسا کہنے سے پہلے مجھے سوچنا
چاہیے تھا۔“

رومیٹھا نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”سٹ اپ رومیٹھا! جان بوجھ کے انجان مت
ہو۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں
اور کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس لڑکی سے شادی کیوں
کر رہا ہوں؟ جب کہ میں تم سے محبت کر رہا ہوں۔“

وہ یہ بات اتنے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہہ
رہا تھا کہ باوجود بے حد شجیدہ ماحول کے، رومیٹھا کی
ایسی بھونک گئی۔

”تم اس سزا فاق سمجھ رہی ہو؟“
”نہیں۔ جیہات تم آج کہہ رہے ہو میں پہلے سے
جانتی ہوں۔“ اس نے شجیدہ ہونے ہوئے کہا۔ ”اور
مجھے خبر تھی اس بات پہ نہیں کہ تم نے یہ مجھ سے آج
کہا۔“ حیرت اس بات پہ ہے کہ اتنی دیر سے کہیں

”مجبور نہیں کر سکتے مگر کچھ نہ کچھ کرنا تو چاہیے ہو
رومیٹھا اپنی سوالیہ نظریں اس پہ کاڑھیں۔

”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ حق نواز صاحب کہ یہ دعائیں آپ بھی
لے سکتے ہیں اس غریب کا گھر بھاگے۔ اسے
معاشرے میں عزت دے کر۔ آپ بھی ٹواب سیٹ
لے سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی ٹیلی کی جانب سے ہونے والی اس
کی تبدیلی کا ازالہ بھی کر سکتے ہو۔ بیوقوفوں افراد کی
منہ بولی میں اسے بے عزت کر دینے کی تھانی بھی
کر سکتے ہو۔“

”ایسا کہو اس کر رہی ہو رومیٹھا۔“ اس کا مقصد
بڑھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
”بڑھتی تو سوچ مجھ کے بات کیا کرو۔“

”سوچ بھی لیں گے میں کون سا تمہیں کھڑے
کھڑے سر پر ہاندھنے کو کہہ رہی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ
ہے کہ جیسے تم اپنے بھائی کو زبردستی مجبور نہیں کر سکتے
میں بھی تم پہ دبا نہیں ڈال سکتی ہوں مگر مجھے تم سے یہ
امید ضرور ہے کہ تم ان کی طرح شقی القلب نہیں ہو
نہ ہی کم ظرف۔ اس لیے مشورہ دے رہی ہوں کہ
تم اس لڑکی سے شادی کرو۔“

”ہیں۔؟ میں شادی کر لوں؟“

”حق نواز جت سے اس کے الفاظ و ہر ادا تھا۔
”اور وہ بھی سوچا اسے؟“

”کیوں کیا برائی ہے سورج!۔ سوائے اس کے
وہ ایک سزا فاق ہے۔ تو وہ بھی یہ نہیں سمجھتی کہ
کی برائی ہے نہ تھانی نہ ہی یہ اس کا تصور ہے۔“

”میں اس وقت یہ بحث نہیں کر رہا کہ اس میں کیا
بائیالیں کوڈ لیا برائیوں۔ تم کوئی حسیہ عالم بھی
سے سامنے لے آؤ گی تب بھی میرا سوال یہی ہو گا کہ
کیوں کر لوں میں اس سے شادی کروں؟“
”تو تو چلی ہو کہ ازالے اور تھانی کی یہی ایک

”ایں انتظار تھا کہ... دیکھو کب ملی قسط سے باہر آئی ہے۔ جیسے انسان اسے صبر اور برداشت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ اس پہ بھی مجھے حیرت ہے۔ نہیں ہے نہیں۔“

اس نے خود ہی اپنے فقرے کی تصحیح کی۔ ایک احتمالی پیچیدہ مسئلہ پیچیز کے اسے بے غلط کر دینے کے بعد وہ خواب ملے چلنے موڑ میں تھی یا شاید دانستہ ایسا کر رہی تھی تاکہ اس کے مشورے کا حق نواز پر جو اثر ہوا ہے اس کے آثار اثرات ذرا کم ہو جائیں۔ تو وہ دوبارہ اسے اس جانب تھکاتے دماغ سے سوچنے پر باطل کر کے مروجہ رویہ صہ کے اس طرح بات پلٹنے پر ایسا تاکہ ایک مسئلے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

”حق نواز حق نواز میری بات تو سنو۔“
رومیہ صہ نے آواز دی مگر اس نے پلٹ کے نہ دیکھا۔

”میں تمہیں دو سروں سے الگ سمجھتی تھی حق نواز اس لیے یہ مشورہ دے رہی تھی۔ مجھے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ تم میری بات مان بھی لو گے۔ صرف یہ امید تھی کہ کم از کم وہ حیاں سے سنو گے تو سہی۔“
تھکرا اس پہ بھڑکتا۔ ظاہر کرتا ہے کہ تم عام مردوں سے الگ نہیں۔“

”لوغت ہے قرین حق نواز۔“ چپ رو کے بات کو ابی ملک کو لے لو آت۔“
حق نواز نے ایک بار پھر اسٹیئرنگ پہ دھکا مارتے ہوئے ٹوپی فٹھہ نکالا۔

”جیسے تو جو صلی کی بات دل میں رکھ کے عزت سے گزرا کر لیا تو اب اکل کے ذیل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اب بھی نہ کہتا اگر وہ بے باک تھی تو مجھے ملنے نہ دیتی۔ مجھے کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ میری جہاد میں جھگڑنے کے لیے لڑ رہی ہو۔“
”جیسے تو صلی کا حق نواز اس پہ یہ عار اٹھی الگ بتائی

جاری ہے کہ میں مجھ کا لیوں آیا وہ اسی اس بلوں سے میرے بھڑکنے کی اصل وجہ نہ جان سکے۔ میں اتنا کم ظریف نہیں کہ سویرا کے ساتھ شادی سے صرف اس کی بدنامی اور اپنی جگہ قبائلی کے خوف سے انکار کروں۔ مگر اتنا اعلیٰ ظرف بھی نہیں کہ ہمدردی اور خدا ترسی کے نام پہ اپنے دل کی اس اولیٰ کو تھکا دوں۔“
کاش تم مجھے سمجھو یا وہ رویہ صہ کاش تم میرے جذبات اور میری محبت کو بھی سمجھ پاؤ۔“

”بس خوش ہو گئے آپ“ پڑ گئی کھینچے میں ٹھٹھک۔“

حمیرا نے آتے ہی اتنا ایک ایک کونے میں پھینکا اور چلا جاتا کے ماں پر رستے لگی۔

”کتنا کہا تھا میں نے کہ یہ ضد چھوڑ دوں۔ کیا کریں گی اس کی شادی کروا کے مگر آپ نے ضرور گڑے مردے اکھاڑے تھے۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ سب ہو گا۔ کتنا وقت لگا تھا یہاں اگر گرنے سے زخمی شروع کرنے میں۔ اور آپ دونوں کی بے کاری ضد نے ساری بنی بنائی عزت ایک بار پھر مٹی میں ملا دی۔“

وہ ماں باپ کو الزام دیتی۔ اب صوفی پہ بیٹھ کے دونوں ہاتھوں میں سر گرائے اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ سویرا اسی کمرے میں کبل میں کھٹی میسرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے چپکے سے یہاں سے اٹھنا چاہا مگر حمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روک لیا۔ وہ

یہی ہے اسے دیکھ کے رہ گئی۔ اسی بے بسی کے ساتھ جس سے یہی ہے اب ذکیہ اور عابد چودھری اپنی سب سے بڑی بیٹی حمیرا کو اونچی آواز میں روتے اور تار اڑھ ہوتے دیکھ رہے تھے۔

”اب کو بھی سب پتا تھا سب جانتے تھے کہ ایسے ضرور ہو گا پھر بھی باز نہیں آئے اپنی کرنے سے۔ اس لیے تو چپ چاپ بیٹھے میری بربادی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ انہی انتہی نہیں ہو رہی ہے کسی کو کہ مجھ سے

پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کہ مجھے یہ آخر کس کی کیا
 جس کا نام کر رہی ہوں میں؟" اس نے۔ وقت اپنی
 اوجھڑا کر گئے تلی ہوں۔" میرے بچے اور میں
 ساتھ کیوں نہیں آیا؟
 "خیر مجھے کاموں سے دو تھیں پوچھوں۔" وہ کہنے لے
 مت کہ مجھے ہی کو شش کی۔ "ہو آیا ہے؟"
 "نہی ہوا ہے۔ وہی ہو ہے۔ جو اسیوں میں لکھا گیا
 ہے۔ لوگ برا کر کے رہا ہے۔ میں تو چاہتی تھیں کس
 کے برا کرنے کا ذرا سہم رہی ہوں۔" آخر میں نے
 یہ کیا تھا جو میری پوری زندگی برباد ہوئی؟ صرف اور
 صرف اس بد وقت کی وجہ سے۔" اس نے روتے
 ہوئے سویرا کی جانب اشارہ کیا۔

سویرا نے ایک بار پھر منظر سے غائب ہونے کی
 کوشش کی۔ مگر میرا کی گرفت اس کے ہاتھ پہ اب
 بھی مضبوط تھی۔
 "یہ کہا گئی ہے سارے فائدہ ان کی خوشیاں۔ یہ
 ڈانٹن یہ پھیل چڑی۔" اچھا ہوتا اگر انی اسے پیدا
 ہوتے ہی مار ڈالتیں۔"

"جیپ کے جانے میرا۔" عابد نے دھڑی سے پہلی بار
 زبان کھولی مگر ان کی آواز میں کرج نہ تھی۔ میرا اس
 کمزور سی تنبیہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مسلسل
 ذہرا ہفتی رہی۔

"یہ ازم از کم تب تو اسے زہر دے دینا یا گھونٹ دینا
 تھا۔ جب اس نے ہمارے انیسویں میں ٹانگ لگی تھی۔
 ماسور کی طرح اسے پالتے رہے آپ دونوں۔ اس کی
 وجہ سے ہم سب کو کیا کیا نہ دیکھنا پڑا پھر بھی یہ سب کی
 لادینی رہی۔ اور تو اور اس بد ذات کا گھر بننے کی
 کوشش میں کیسے میرا بسا گیا؟" عابد نے بازو ہلاتے ہوئے

وہ بول تو بہ کے آگے بڑھی جیسے سویرا پہلے بڑے
 کی جگہ پر سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچ لیں
 میں دہری سویرا کی جانب جانے سے روکا تھا۔

سویرا کانپتے ہوئے میرا کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔
 اس کے آنکھوں میں ہلکی سی آنسو تھے۔
 "ہوش کر میرا۔" وہ کہنے لگا۔

"اسپ میں میں ہی ہوں کہ وہ؟" عابد نے اس کی طرف
 اٹھنا چاہتے تھے۔
 "میرا ہر اڑ رہا ہے۔" میرے بچے نے ہاتھ لگائے
 ہزار ہتھکڑی کے کمرے سے نکلا تو سب حیرت سے
 اب میں اپنی اولاد کی فعل میں مجھے تو اس کا
 اپنی اولاد کا کھنکھانے کا۔ میرا ہوا میں ہوا
 پہ بدنامی کے اسٹے ہاتھ میں کیسے ہوا؟
 سے میرے بچوں کی تنگی کو لے۔ وہ میری تنگی کی
 تھی وہ اس کی وجہ سے۔ میرے بچے کے لئے
 میں سب کی عمر میں عابد صاحب ہوا تو میرے
 میں نے آپ کو بول کی عزت رشتہ کی خاطر اس
 بولے کے ساتھ بھی صبر کے ساتھ دیا ہے۔
 سرال دلوں کا ہر علم بھی سنا۔ لیکن مجھے اپنی
 قربانوں کا کیا سدا؟ اس منوں کی وجہ سے میرے ہاتھ
 سب کی عمر سنی میرے بچے سب بچے میرے ہاتھوں
 سے چلا گیا۔ میں ایک بار پھر غلط ہوا تو وہی ہوں۔ اب
 تو میں اسے بائیں بھی نہیں چھو لوں گی۔ کبھی بھی
 نہیں۔"

بوتے بوتے اس نے ایک دم ٹوٹ کر بول کی گرفت
 سے آزاد کر لیا اور سویرا پہ ہل چڑی۔ یہ عمل اتنا اچانک
 اور شدید تھا کہ بالکل قریب چھٹی میرا بھی اسے ان
 وحشتانہ مہمو کوں سے فوراً نہ بچا سکی۔

"تمہارا دل خراب ہو گیا ہے ہانی؟" میرا نے
 میرا کی گرفت سے اس کے ہاتھ پھڑکنے کی کوشش
 کرتے ہوئے کہا۔

"اس بے چاری کا کیا قصور ہے اس میں۔ وہ تو خود
 سبوں سے ہے۔" کہتے کہتے اس نے ہاتھ کے ہاتھ کی
 جانب دیکھا جیسے ابھی ابھی ان کی مودوں کی کا اس پر ہوا
 ہو۔ عابد نے دھڑی جذبات قدموں سے اپنے فلتے
 و شہر تھوڑے تھوڑے کو کھینچنے پھر لے گئے۔

کمرے کے ہونا ناک سکوت میں میرا کی بھری
 وحشتانہ سنا تھیں اور سویرا کی دلی سسکیں کی آواز
 ابھر رہی تھی۔ میرا نے ایک بار پھر اسے اپنے بچے
 سے لگایا۔ سویرا نے دلی دلی سرخ آنکھیں اٹھائے

باب اندھیرے کمرے میں جتن چھپاتے رو رہا تھا۔
 بار بھر اس کی بہن اس پہ اپنے اترنے کا ارادہ کر رہی تھی اور اس بار میرا اسے اسے اپنے اندھیرے
 میں چھپنے کے اور چھپنے کر سکی تھی۔
 پکے کی طرح کھلی کے دو چال۔ جو میلے کی کوئی
 لکھ۔ امید کی کوئی کرن اس کے پاس نہ تھی۔



"اگر تم نے دوبارہ پہلی کے بارے میں ایسے کہا تو میں اس کی گوجا کے ہاتھوں کی۔ وہ بے جا رہی نہیں
 کیا کہتی ہے۔ تمہیں ابھی نہیں ملتی تو نہ سنی امت
 بات کرو اس سے۔ مجھے روکنے کی ضرورت نہیں۔"
 بھڑبھڑاتے دن کا مہو مل رہی۔ یہاں تک کہ
 سویرا آئیں گے ساتھ اسکول جانے لگی۔ کیا معلوم۔
 نے تو کبھی نہ دوسرے پہلی آہستہ آہستہ نہیں
 بہت بچے رہ گئے۔ اب صرف سویرا عید تھی ہو اگرچہ
 بہت زیادہ ہوا۔ بہت زیادہ مضبوط تھی۔ یہ بھی
 لیکن اتنی سنی ہوئی اتنی کائناتی ہوئی بھی نہ تھی۔ وہ
 نوکریں مل کی پہلی۔ اس بات نے میرا کو بھی بہت
 حوصلہ دیا۔ اس کی بیٹھ سے یہ کوشش رہی تھی کہ
 سویرا اس کے سارے کے بغیر بھی بیٹھا سیکھ لے اور
 رفتہ رفتہ یہ ہو رہا تھا یہاں تک کہ اس کی شادی کا ذکر
 ہوئے لگے۔ اس موقع پر وہ ایک بار پھر گھبراہٹی نظروں
 آنے لگی۔ یہاں بھی میرا نے اس کی مدد کی۔

"تمہیں ایک بار مل رہی تھی جیسے کا حق ہے تم کسی
 سے کم نہیں بلکہ میں تو کہتی ہوں تم مجھ سے اور باہش
 سے بھی لاکھ دو بے ہستہ ہو۔ صرف شکل و صورت
 کے لحاظ سے بلکہ کردار و سیرت، تعلیم و ذہانت اور سلطنت
 اور گھر بستی کے لحاظ سے بھی۔ اللہ اللہ تمہیں دین کی
 بھی سمجھ ہے اور دنیا کا بھی شعور ہے۔ تم بچو لقمہ نمازی
 ہو۔ قرآن کی روح کو سمجھتی ہو۔ مجھ سے زیادہ بہتر اس
 بات کو جانتی ہو گی کہ اللہ کسی کو بھی اس کے باہر حق
 سے محروم نہیں رکھتا۔ زندگی کی انوشیوں پہ تمہارا بھی
 حق ہے۔ انہیں بے جھجک وصول کرو اور اپنے دل میں

کہہ دو کہ وہ سب کو چاہئے۔ دوست۔"
 لیکن سویرا اس بدلتے ہوئے شکل کو یہ عمل نہ
 کر سکی۔ اس نے باب کی مرضی کے آگے سر نہیں
 جھکا لایا تھا لیکن وہ ان دوسروں کو مل کے گرد نہ کر سکی
 جو منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑے تھے اور وقت
 نے ان پر ترین اندیشوں کو بچ کر رکھ لیا۔ ایک بار پھر اس
 کی زندگی کا ناقص برداشت وراثت کی ڈوب میں گئی۔ ایک
 بار پھر اس کا بار کا سر جھکا دیا تھا۔ لگ بھگ اس کا

"کھانا لگاؤں بیٹا! حق نواز گھر آیا تو ختمیم بچہ لے
 پوچھا اور پھر اس کے انکار کے بعد گھر کی سائیں بھر کے
 رہ گئیں۔"
 "پتا نہیں سب کی جھجک کو کیا ہو گیا ہے۔ غور ہے
 بھی مع بغیر ناشتے کے اپنے گھر لوٹی ہے۔ تمہارے لپا
 ہیں تو ملا دو وہ کپ چائے لگے اور پچھ وعدے میں نہیں
 اترے۔ شاد نواز بھی کھانے سے منع کر رہا ہے۔ لودھی
 چارنگ کر رہے ہیں اور پھر کے اور ابھی تک ہمارے گھر میں
 کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ میں پوچھتی ہوں ایسی بھی
 کیا آفت نوٹ پڑی۔" وہ کچھ ناراض ناراض سی
 بولیں۔

"تھیک ہے ابھی بھلی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔
 کیا مجھے انہیں اس بات تک میں مان ہوں؟
 میرے ارمان بھی تو پورے ہونے سے روکے لیکن کیا
 اب اس کا ماتم عمر بھر منایا جائے گا۔ مرذات ہے؟
 نہیں تو نہ سنی۔ کل وہی جگہ رشتہ ہو جائے گا اسی
 دھوم دھام سے بارات نکال لے جائیں۔ اب چھوٹو
 بھی اس بات کا پتہ چلا۔"

"ہاں وہ تو مرذات ہے؟ آج نہیں تو کل وہی جگہ
 رشتہ ہو جائے گا اور دھوم دھام سے بارات بھی جائے
 گی مگر ختمیم بیگم! یہ روکے اس بچی کا دھیان آتا ہے
 نہیں کی اس کے دل بارات اتنی تھی مگر۔" وہ نواز نے
 دھکی لگے میں لگا۔

"ہاں ابھی! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ہر کوئی
 اس کو اکتارے گا اتنے دیر اور بدترین اثرات نہیں
 سکتے۔ اس کے بارے میں ہم اسے بھلا نہیں پاتے۔"

بہار سے پہلے اس کے افسانوں اور اداوں سے رنج
 نہیں پیدا تو اس کہ میں اس وقت کیا مانوں ہو گا۔ وہ
 فریاد اس کے دل پہلے اس کے من بھلی۔
 سوچنے سے پہلے اس کے من بھلی۔
 وہ بہرہ کیا تصور ہے؟ ہم کیوں مجرم نہیں اپنی نظموں
 کے ساتھ دیکھنے میں تو اس کی بات کہ نہ ہو۔
 یہ خدا کا ان لوگوں کا بھی نہیں تھا ان کی عظمت خدا
 نے سوچے تھے ان کا تماشہ کر دیا۔

مگر نہ چاہے رہو۔ زیادہ انقلابی بننے کی ضرورت
 ہے۔ تصور کیے نہیں ہے ان کے اگر اللہ نے ان کا
 دیا تھا تو کیا ضرورت تھی ایک بار پھر اپنا اشتہار
 کھانے کی۔ "وہابی" کی شادی کرنا تو دھوکا دینا ہوتا
 ہے عظمت لی لی نے نہیں دھوکا کھانے سے بچایا
 ہے۔ یہ تو خدا نہیں کیا۔

"شہزادہ" تم کیوں خاموش ہو؟ کچھ بولو گے
 نہیں۔ "حق تو اس نے یہ ساری لکھو ایک گہری چپ
 کے ساتھ رہتے ہوئے اپنے بھائی سے بوجھ
 "ایا تمہارے خیال میں بھی عظمت خدا کا
 طرز عمل درست تھا؟"

"ہاں نہیں۔ شاید نہیں۔ انہیں اکیلے میں
 جس کی بات سنائی دے گی۔
 "تیس۔ تب تم کیا کرتے؟" حق تو اس نے سب نالی
 سے پوچھا۔

"میرا وہ اتنا تماشہ کرانا ہوتا ہے اور خاموشی
 سے نہیں آجاتے دنیا کی سائنسے بڑا بنایا جاسکتا تھا
 لیکن بھی عزت و بابتی ہماری تھی۔"

حق تو اس کا سارا اشتہار چھوٹ گیا۔
 "جی تو میں کہہ رہا تھا۔" رب تو اس نے تادیبی
 کی۔ "میرا وہ اتنا تماشہ کرانا ہوتا ہے اور خاموشی
 سے نہیں آجاتے دنیا کی سائنسے بڑا بنایا جاسکتا تھا
 لیکن بھی عزت و بابتی ہماری تھی۔"

"تو ایسی بات تو یہ کہ میں نہ تو اس لڑکی کو بھول ہی کے
 "وہابی" مانا ہوں نہ ہی مجھے آپ کی اس بات سے
 امکان ہے کہ اس کے ساتھ کرنے والا خدا اس کا
 محب ہے اور مجھے آپ وہ لوگوں کی اس نرم دلی اس
 اور دلی اور اس خدا ترسی نے بھی دلی بھر حاشہ نہیں
 کیا۔ اگر آپ لوگوں کے دل پہ کوئی بوجھ ہے بھی تو
 اصل میں آپ اس بوجھ کو کچھ نہیں دیکھ رہے ہیں
 تفسیر میں سر ہلا کے اور اس لڑکی اور اس کے گھر
 والوں سے جو دلی تعلق ہے یا عظمت خدا کے سچ
 سارا الزام اصل کے ملکا نہیں ہو سکتا اس بوجھ کو
 پٹانے کے لیے آپ کو عقلی معنوں میں کوئی جرأت
 مند نہ قدم اٹھا ہو گا۔"

"میں جاننا ہوں ہم کیا کرنا چاہتے ہو۔" شہزادہ کا
 ہو گیا۔ اس کے انداز سے اضطراب ہوا تھا۔
 ہو گا کہ تم اپنا تہ بند ہی نہ کھو۔ ہمیشہ سے کوئی بھی اس
 کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسی باتیں میں قصوں اور
 ناولوں تک میں چھپا رہے ہیں کرنا اس لیے مجھ سے
 یہ اعتراف مت رکھو۔"

"وہ لوگ اور بولتے ہیں میرے بھائی جس سے کوئی
 امید نہیں رکھتا ہے۔" شہزادہ کو رے جواب دہ
 صبح ہو گیا۔

"چلو چھوڑو یہ باتیں" بلوچہ جھلی جھلی کیوں ہاتھ
 ہوا۔ "تسلیم یکم اپنے پھوٹے تینے کی مزاح کشیا نہیں
 اس کے چہرے کے ڈھرتا ہوتے کے اندر جلا
 میں کوئی میرے معنوں بات نہیں کہ خدا میں اور
 موضوع پر تھپتھپ۔

"انہیں اپنی تو قسم کر رہا ہوں" لڑکی ہاتھ اس لڑکی
 کے لیے تھپتھپاتی ہے۔ "تو خود نہیں جانتا تو
 اس نے یہ فیصلہ کیا اور کیسے کیا یا پھر کرنے سے پہلے
 ہی سارا اللہ بتا چکی سب اس اہلک و حالک پر حیران
 تھے۔ لڑکی کی شہزادہ بھی تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل وہاں
 مستند تھا تو وہاں سے ناراض ہو کے آیا تھا۔ دلی
 تھا کہ اس کی دلی میں اس سے گلے شکوے کرنا تھا
 اس کے اس لیے یہ بھوک اس کے سامنے رکھی اور

”تسار ابلغ خراب ہو گیا ہے حق نواز“ شہ نواز
 باہر گئے لگتے پڑا تھا۔
 ”میں ابلات سوچ کر کرا رہا ہوں۔“ رب نواز جو
 بلکہ درخت کی نہامت کا اظہار کر رہے تھے آپ ان کے
 پر سے ناکواری واضح تھی۔

یہ وہ مکی جانا تھا کہ وہ یہ بات بغیر سوچے سمجھے کہ
 کیا ہے مگر حب و الغہ تو یہ تھا کہ بہت سی سوچی سمجھی
 باتوں کے برعکس یہ بات کہہ دینے کے بعد وہ خود کو
 غصا مضمین محسوس کر رہا تھا۔ کھیلے دو تین دنوں سے
 ایک بے نامی کی مجلس نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اب وہ
 مجلس کیس نہیں تھی۔

”جب سے یہ اس اخبار کی نوکری کرنے لگا ہے“
 ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔ آپ تو اپنی
 سب سے پہلے اس کی یہ نوکری ختم کر آئیں اور میں
 انگریزی ہوں اس کے سر سے یہ شادی والا بھوت۔“ وہ
 غصہ میں لگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے پرہیز۔

”میں اس کی ساری چال سمجھ جاتی ہوں۔ اصل میں
 تو یہ شادی کرنا چاہتا ہے اپنے ساتھ دفتر میں نوکری
 کرنے والی اس مرد مار عورت سے جس کی کبھی
 تصویریں اخبار میں چھپی ہوتی ہیں تو کبھی ٹی وی پر
 مردوں کے درمیان بیٹھ کر تقریریں کر رہی ہوتی ہے۔“

اسے یہ ہے تاہم میں نے مر کے بھی ہاں نہیں کرنی“
 اس نے ”وہ سچا ہے پھر تک رہا ہے ایسی جگہ شادی
 کرنے کی دھمکی دے رہا ہے کہ میں مجبور ہو کے خود
 کہہ دوں کہ نہ بیٹا یہاں کٹا ہوا لیتا اس سے اچھا ہے

میں تمہاری شادی تمہاری شادی کی جگہ کر دیتی ہوں
 مگر اس ملک فلاحی میں مت رہنا۔ میں ان بے وقوف
 باتوں میں سے نہیں ہوں جو ایسی چالوں میں آکر لپک
 جاتی ہو جاتی ہیں۔“

”میرے خدا۔“ وہ اس کی اتنی دور کی کوڑی لاسے
 یہ چہرہ ان رہ گیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔“
 ”ایسی ہی بات ہے کہ میں محول کر رہی ہوں۔“
 ”میں شہ نواز، خرافات سے ہونے والی جو مولانا

کے بھی لکھ کر لے رہی ہے اور نہ وہیں خود مرے ہم ایک
 بار پہلے لکھ کے آئے ہیں۔“

”میں یہاں کی کبھی کبھار سب دیکھ رہی ہوں
 جن میں ملکہ ذیل کر کے لگی ہیں اور میں اس مجلس کو
 ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔“ آپ میں سے کوئی بڑا سا
 دے گا وہ مجھ پر ایمان نہیں کرے گا ملکہ اسے جرم کا
 نظارہ ہی ادا کرے گا اور وہ ساتھ میں اسے گا وہ یہ
 مت سمجھے کہ اس کے ایسا کرنے سے میری بہت خود
 پڑ جائے گی۔“ وہ واضح الفاظ میں لکھاؤں سے لکھ گیا۔

خبریں یکدم دیر تک غصے سے کھینچی بیٹھیں تو
 کبھی بلند آواز میں سوچا کہ کوئی نکلتی۔ کبھی
 رومبہ صحن کے غائب کا نشانہ بنتی۔ رب نواز انہیں
 خاموش کراتے ہوئے یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ یہ سب
 حق نواز کی واقعی جذباتیت ہے اور وہ حقیقت میں ایسا
 کچھ نہیں کرے گا جس سے اس کے سبب آپ کو مجس
 پہنچے۔ ان دونوں سے الگ شدہ نواز بہت خاموش
 تھا اتفاقاً اس کا چہرہ پر مل رہا تھا۔

کبھی وہیں خوف نظر آتا۔ کبھی ٹپک۔ کبھی غم
 اور کبھی بے بسی۔



”یہ تو ایک بہت معمولی واقعہ ہے رومبہ صحن
 ہے تمہارے جیسی لڑکی جو عملی صحافت میں آتی
 عرب سے ہے وہ اس واقعے سے اتنی متاثر نظر آ رہی
 ہے۔“

فرخندہ لودھی نے اسے اتنا ڈسپ و کچ کر کہ
 رومبہ صحن شکی نظموں سے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ آپ اسے معمولی واقعہ کہہ رہی ہیں فرخندہ۔
 ایک لڑکی کے لیے وقت سے پہلے آگئی اور وہ اس بے
 پرواہی اور اصرار سے ہو ناغہ اب نہیں۔“

”میں یہ تو بہت بڑی بات ہے معمولی بات تو وہ بھی
 نہیں ہوتی جب کوئی بد قماش لگا کر آپ سے گزرتے
 ہو تو کھینچ لیتی ہے جو کہ زبرد جانا ہے۔“

”آپ اس مسئلہ میں کچھ کرنے کی کوشش کریں؟“

جس حد تک یہ سکتا ہے جس اور میرے ساتھی
 کرتے ہیں مگر اس کے لیے ہمیں والدین اور اساتذہ کا
 تعاون و رکنہ ہے جو بد قسمتی سے ہمیں میسر نہیں۔ میں
 نے چھپتے ہوئے ایک پیچہ در کسٹپ میں پیکر کے
 وہ دن یہ تجویز پیش کی تھی کہ پیچہ کو راکٹری لیول تک
 کے بچوں کو مناسب الفاظ اور دوستانہ انداز میں پہنچانا
 چاہیے کہ انہیں انہی لوگوں سے جس حد تک گریز
 برتا جائے۔ یہاں تک کہ ان کے جاننے والے لوگ
 بھی اگر زیادہ بے لگھی و کماٹے ہیں تو انہیں عزامت
 کئی چاہیے اپنے والدین کو پہنچانا چاہیے لیکن میری
 اس بات کی پرورد مخالفت ہوئی۔ خاص طور پر اسکولوں
 کے مالکان کا یہ کہنا تھا کہ بچوں کے والدین اس "یکس
 ایجوکیشن" پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا
 اسے "یکس ایجوکیشن" کے ذمے میں لا کر قاتل
 اعتراض ٹھہرایا جا سکتا ہے اس طرح تو اسکول لیول
 تک سائنس کے مضامین میں سے یا لونی کو ختم کر دینا
 چاہیے اور گھروں میں بی وی کیبل اور انٹرنیٹ کے
 ذریعے وہ اپنے بچوں کو جس قسم کی ایجوکیشن دے رہے
 ہیں وہ کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے رومبھدلی لی بار
 بچوں سے زیادہ ان کے والدین کو شعور دینے کی
 ضرورت ہے اس معاشرے میں بچوں کے ساتھ
 زیادتی کے واقعات میں نوکے فیصد ذمہ دار ان کے
 والدین ہوتے ہیں۔ ان کا اپنے رشتہ داروں سے مدد سے
 زیادہ احتیاط کبھی یہ دن دکھاتا ہے تو کبھی اسلامی تعلیمات
 کے سراسر خلاف جا کے بڑھتے ہوئے بچوں کو "مقصوم
 اور بے ضرر" سمجھتا رہے یہ تصور نہیں کر سکتے کہ ان
 کے غور و سولہ سال کے بچانے نتیجہ کن ہے بچوں کو
 خدا کی بھائی سمجھنے کے علاوہ کوئی اور خیال بھی مل نہیں
 لاسکتے ہیں اور اس طرح بہت سے بچے گزرتے گئے انھوں
 کو اور جانتے ہیں کہ یہ بھی والدین کی ذمہ داری ہے ان کو کھائی
 سے بچنے دن کا بیشتر حصہ کھل کر گزارتے ہیں جس کے
 ساتھ رہتے ہیں کھل رہے ہیں یہ جاننے کی زحمت
 نہیں کی جاتی۔

اور میرے خدا! "رومبھدلی" جس جہی لی۔

کھائی ہوئے کے ہاتھ یہ خبریں اس کے لیے معمول
 حصہ تھیں۔ اب تو ہر جگہ سے خبریں سننے
 اپنے والدین کی خبر آتی رہتی تھی مگر ایک صورت ہونے
 کے ساتھ وہ ہر بار اپنے دل کو کاپ اٹھنے سے روک
 نہیں پاتی تھی۔

"تمیں رومبھدلی" صاف طے طبع کا ہی ہے
 نہیں یہ درست ہے کہ بڑے اہم کی شہر نسبتاً اس
 طبقے میں زیادہ ہے۔ لہذا کور اشیاء کا استعمال بھی زیادہ
 نہیں ہوتا ہے مگر بچوں کا تحصیل یہ واحد مسکن
 ہے جو ہر طبقے میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن
 اپر کلاس سے لے کر نفل اور لوئر کلاس تک بچے ہر جگہ
 پائس رہے ہیں۔ لوئر کلاس میں خاص طور پر مٹی
 آبلوں اور بھونپڑی کے رہنے والوں میں کم عمر بچوں
 کو ان کی تشنگ آواز میں ایک جاگرت "ایکسا ایلو پیا
 دو تین روپے کے لٹائی میں ششے کے ٹکڑی اور ہوس کے
 پھاریوں کے تعفن زدہ کوارٹروں اور بھونپڑیوں تک
 لے جاتی ہیں تو نفل کلاس میں خاص طور پر جو لکٹ
 ٹیلی سکیم میں ماؤں کی بے توجہی انہیں بڑا گزرا تھی
 ہے۔ کلام کا جو گور اور فر انش کی زیادتی انہیں مجبور کر لی
 ہے کہ وہ بچوں کو رشتے کے بھائیوں یا بھائیوں کو بھول جائیں
 اور خاؤوں کے سپرو کر دیں۔ اب اگر گھر میں چھاپا
 وادیاں موجود ہوں تو بچت ہو جاتی ہے ورنہ زیادہ تر
 میڈیا کی گرم نوازی کے باعث وقت سے پہلے ہولن
 ہو جاتے والے گزرتے ہوئے۔ قلم نہیں رکھتے اور بے
 چارے مقصود سے اپنے ہی گھر میں اٹ جاتے ہیں۔
 اپر کلاس میں یہ کلام ملازموں اور ڈرائیوروں نے سنبھالا
 جو اب تمام مال باپ دونوں جانب کرتے ہیں یا میں بے
 سہارے گھر میں کوئی بزرگ نہیں ہے بچے دن کا
 بیشتر حصہ گھر پر اکیلے ملازم کے ساتھ گزارتے ہیں۔
 وہاں ان واقعات کا ہونا معمول کی بات ہے۔ باپ
 کو انوں کی ذمہ داری کرنا اور ان تقریبات کے دن کا تہ
 جاتی ہے اور بند کمروں میں بچوں کی معصومیت یاد رکھ
 ہوئی رہتی ہے۔

اس قبیلہ میں آنے کے بعد میں نے اکثر سنا ہے

اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو اسے دیکھو

اور اس نے مزید کہنے سے باز رہا۔

پہلیں وہ اس بات پر اسے اس میں نہ لگے پھر

حق نواز کو یوں لگا جسے اس کمرے کی بھرتی



اس نے دو سری جانب سے تعقیق چاہتے پائے

تعارف ہوا۔

اور میں حق نواز کی مل بات کر رہی ہوں۔

یہ سخت لہجے میں کہا گیا وہ الٹ ہو گئی۔

”جی آئی! اسلام علیکم کہیے کیا خدمت کر سکتی

ہوں میں آپ کی؟“ بہت چاہتے ہوئے بھی وہ اس

سے حق نواز کے متعلق نہ پوچھ سکی جو نہ تو دو روز سے

اتنے آ رہا تھا اور نہ ہی خون پہ اس سے رابطہ ہوا یا

تھا۔ رومبہ کے خیال میں یہ سب اس کے اس دن

والے مشورے کا رد عمل تھا۔

”تم بیسیوں نے کسی کی کیا خدمت کر لی ہے

تم اپنی اپنی گھروالوں کی ہی کوئی خدمت کر لو تو بہت

ہو گا۔“ اس نے مخالف رکھولی لی اور ہونٹوں کو مسرت

شہ نواز خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بچھ سی

تھیں۔ وہ اسے دیکھتا تھا کہ اس کے پاس

”بہت“ انگریزوں نے۔ میں نے کچھ نہیں کیا

اور ہم سب میرا مطلب ہے ہمارے خاندان کا کیا

”مگر“ اسے کچھ نہیں کیا شہ نواز احم مدہو

خود بخود ہو۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا مگر تم

ہدایات کے آگے بڑھیں ہو گئے۔ کیا یہ تمہارا قصور

نہیں ہے؟ کیا تم نے ہمارے والد کا کام نہیں کیا؟ تم از

کرمیں اتنی آسانی سے اس معاملے سے الگ نہیں

ہو سکتے۔“

”لیکن تمہیں حق نوازیات کو سمجھو اس سے شادی

نہیں کر سکتے یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”تم ذی بہت واقفیت اپنے دین سے مجھے بھی ہے

اور میرے محدود علم کے مطابق کسی ایسی لڑکی سے

نکاح کرنا کسی بھی طرح غلط نہیں قرار دیا جاسکتا جو کم

عمری میں کسی کی جبری زیادتی کا شکار ہوئی ہو۔ جب

اسلام کی رو سے یہ غلط نہیں تو تم اور کس حوالے سے

اسے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو؟

”تم سمجھتے کیوں نہیں سب جادہ ہو جائے گا۔ مٹی

میں مل جائے گا۔ کیوں نہیں مان جاتے تمہے کیوں

سب کچھ بولا کرنے پر تھے ہوئے ہو۔“ وہ اپنے بیل

دونوں ٹھنڈوں میں جکڑے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ حق

نواز کو اس کا یہ اٹھا ہوا انداز نہ لگایا۔ وہ اپنی مٹوانا جانتا

تھا اور حق نواز پر تو اکثر ہی اپنے بڑے بن کار عب و مال

کر لیتا تھا۔ اس نے مرضی چلائی اور بات چیت میں اس کے

انداز میں حکم اور اس کی جگہ سے کسی بھی ایک

مجیب طرز کی بے فنی تھی۔

”تم میرا اور میرا کیا سمجھتا ہو؟“ وہ جھگڑا

بہت آواز میں کہتے ہوئے۔ اس کے بالکل سامنے

گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا۔

”تم سب کچھ یہ کہہ رہے ہو۔“

یہ نام او۔ اور یہ رشتہ سب پر حاوی تھا۔

جہاں وہ چلے گا وہاں چلے گا اور وہ یہ سب تمہاری
مادہ کی طرف سے کر کے لے کر رہا ہے۔ مت سمجھنا
میں تمہاری خدمت کروں گی۔ اور اپنے بیٹے کو چلنے
کے لیے کہیں ہو بیٹا۔ نکلوں کرلوں گی۔" وہ سب حد

تک پہنچ گیا۔ وہ تو کوئی امید ہے نہ خواہش۔ اور
نہی نہ کہ کچھ نقص مجھے خوش کرنے کے لیے سوچا
سے شادی کر رہا رہا ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے وہ ایسا
صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہو
اور اب میرا مشورہ مانیں گی تو میں پھر بھی کہہ دوں کہ
اسے ایسا کرنے دیں۔ آپ کی عاقبت سنو رہے ہیں۔
آپ نے خود تو شاید ہی سمجھ کر کوئی ثواب کمایا ہو۔
اسے اس ثواب سے روک کر گناہ گار مت بنیں۔"

اس نے تسلیم بیگم کا رد عمل جاننے کی دھمکی کیے
بغیر فون بند کر دیا۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر دواؤں اس
قابو میں آئے تو تھکے سر سے اس اطاعت پر غور کیا۔
"ایسا واقعی وہ سوچا ہے شادی کرنے جا رہا ہے؟ اگر
اس کی امی بھوت نہیں کہہ رہیں تو پھر یقیناً ایسا ہو سکے
رہے گا کیونکہ ان کا تو میں جانتی ہوں اسے۔ وہ خالی غفلتی
باتیں کرنے والوں میں سے نہیں۔ اگر اس نے ایسا کہا
ہے تو یقیناً کر کے بھی دکھائے گا لیکن اس دن میرے
سامنے تو تب وہ یوں بھر کا تھا جیسے میں نے اسے
خود کشی کا مشورہ دے دیا ہو اور۔۔۔ اور اس کا وہ عمو۔"

اس کے ذہن میں حق نواز کے الفاظ گونجنے لگے۔
"میں اس لڑکی سے شادی کیا کروں جبکہ میں تم
سے محبت کرتا ہوں۔"

"تو جو اب تمہیں شادی کیوں کر دے ہو۔" اس کے
دل نے ٹھک کر کہا۔ یہ اس کے حقیقی لیے کوئی خواہش
وہا۔

"خود غرضی مت دکھاؤ۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ
چاہے میرے گھر پر۔ یا اپنی مرضی سے یا کسی بھی اور
وجہ سے میرا ایک دوست ایک اچھا کام کرنے جا رہا
ہے۔ مجھے اس کی خوشنودی کرنا چاہیے مگر وہ ہے
کہاں؟ کیاں؟ مجھے پتا ہے۔"

وہ ایک بار پھر اس کا نمبر ماننے لگی۔

"میں اسے تھاؤں حق نواز! مجھ سے چاہتے آپ
سے؟" اس نے اپنے اندر بھانپتے اس کے عکس سے
چپکے سے سوال کیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس عکس کو
اس کے سوا کوئی اور دیکھے۔ "حق نواز! مجھے نہیں؟
اس لیے زندگی میں سبھی بار اس نے دل پہ غور سے لیتے
اس عکس کو دہرتے دہرتے مخاطب کیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں دسے سیل فون یہ ہونے والی
واپس لینے کے متوجہ کیا۔ اسکرین پر فرخندہ لودھی
کا نام بھونک رہا تھا۔

"کریس کو ریمکس کے لیے آسکتی ہو؟"

"میں؟؟ کوئی خاص واقعہ ہے؟ رپورٹنگ کے
لیے عمو؟ حق نواز! پھر ریمکس۔"

"تم جس نیچے کام کر رہی ہو اس سے متعلق ہے۔"
اس نے جیسے فون کیا ہے۔

روم بھونک رہا تھا۔ سب بھول بھلی کے فرخندہ لودھی
کے "مخصوص گھر" جانے کو تیار تھی۔ شہر میں مہو
وہ سب سے بہت سے عظیم خانوں اور دارالامانوں سے
بالکل مختلف ماحول تھا یہاں کہ۔ یہاں ایسے بچوں کو
انسانی سدھار کے لیے عارضی طور پر رکھا جاتا تھا جو
حالات کی وجہ سے بچپن کی مصومیت کو ترک کر کے
جرائم کی راہ پر چل پڑتے تھے۔ یہاں رکھ کے انہیں
معاشرے کا کارآمد اور فرض شناس افراد بننے کی تربیت
دی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی راہیں منتخب کرنے
میں آزاد ہوتے تھے۔ یہاں ایسے ادارت کے بچے بھی
ہوتے تھے جن کے ماں باپ انہیں قبول کرنے سے
انکاری تھے۔ اور پھر ہر بچہ اپنی جگہ ایک کہانی تھا اور
روم بھونک رہی کہانیوں کو ترتیب دے کر آج کل وہ
سلسلہ دار فچر لکھ رہی تھی جو عوام میں تھمک چکا رہا

تھا۔ "مخفی پولیس نے بچوں کا ایک گروہ پکڑا ہے جو
جسم فروشی کے مکروہ پیشے سے منسلک ہیں۔ اس گروہ
میں چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچے شامل
ہیں۔"

”اسنے تم کو مر نہیں دیا۔ یہ سچ اپنی مرضی سے تو اس
دھندے سے باز نہیں ہوں گے۔“

”یقیناً ان کے پیچھے کوئی بڑا ہتھ ہے مگر ان بچوں
میں سے اکثریت کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ وہ زبردستی یا
جبوراً یہ کام کر رہے ہیں۔ شاید ان کی پرورش و تربیت کی
گئی ہے یا پھر ان کی نیا دانی نے ان سے کسی بھی اچھائی
رائی کی تیز کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ میرے
دیکھنے سے ان بچوں کی کسٹڈی حاصل کر لی ہے
کیونکہ مجھے شک ہے اس گروہ کے پیچھے جو بھی ہے وہ
ان بچوں کو چوں سے مارنے لگی کو شش ضرور کرے گا۔
جس بچے کی وجہ سے پولیس اس گروہ کو قابو میں کر پائی
ہے وہ ایک چودہ سال کا لڑکا ہے۔ صوبہ سرحد سے ہے
ان قبل آیا ہے اور ان کی حالت میں اپنے لیے گائیڈ
تلاش کر رہا تھا۔ تو میں سمجھتا ہوں ان بچوں سے ملوانی
ہوں۔“

رومیہ فوراً ”فرخندہ کے ہمراہ ان لڑکوں سے ملنے
اچھی تھی مگر وہاں ان کے چہرے ایک کے بعد ایک
دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ کس قدر مشکل کام
تھا۔“

ان چہروں پر کیا کچھ نہیں تھا۔ بھوک، افلاس، مہر
نفرت۔ کراہیت، مظلومیت سب تھا۔ اگر نہیں
تھی تو معصومیت، جو اس عمر کا امتیاز ہوتی ہے۔ اسے
ان ”بالغ آنکھوں“ میں جھانکنے سے خوف آ رہا تھا۔
”اور یہ گل شاہد عمر چودہ سال مگر ان کی زیادتی
اور جسم فردوسی نے جس کے اندر مزید چودہ دنوں کی
زندگی بھی پائی نہیں رہتی۔“

وہ اس وجود کے آگے ٹھہم گئی۔ وہ بولا پتلا، لمبا سا اور
بکھرے لمبا لے بالوں والا لڑکا تھا جس کے فرشتے ہاتھ پیر
موٹے، سبز، ہامیز، حاسا پڑا تھا، اس کا سر دیوار سے ٹکا
ہو دھتھ پڑ نہیں کیوں رو میہ صدمہ، کاشمیر سے تھی چاہا
وہ اس کا چہرہ دیکھے۔ حالانکہ اس سے پہلے چار چہرے
دیکھے کر اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا تلاش وہ یہ چہرے
نہ دیکھ سکتی۔
مگر اس چہرے کو دیکھنے کی چاہا تھی بڑی بڑی کہ وہ ہفتوں

کے لیے بیٹھ گئی۔

”سنو، اوپر دیکھو۔“

پتہ نہیں اس تک رو میہ کی آواز پہنچا تھا۔
وہ اپنے وحیان میں دوپٹے پر اپنی سوچی سمجھی کرداروں سے
کچھ لکھ رہا تھا، رو میہ صدمہ نے نور سے دیکھا تھا کہ اس
کی آنکھوں کی حرکت کیا نقطہ بن رہی ہے اور شب
چونک سی گئی۔ اس کا پی پی ایک گری چوٹ کا لکھن
اسے مت کچھ یاد آ رہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بیٹھ اور
آگے ہوئی۔ اس لڑکے کے شانے پڑے اس نے اس
کامز اپنی جانب کیا۔ مدھوشی سے بند ہوئی آنکھیں۔
رال پکڑتے سفید لباس سے جڑی مٹی
بھونیس۔ ستواں ٹاک اور اس کے میں ادھر سرخی
ماکل، صبر اقل۔

”علی۔“ رو میہ صدمہ کے حلق سے کراہی اٹھی۔ اس
سے چند قدم آگے چلتی فرخندہ صدمہ کے چٹائی تھی۔
”تم جلی ہو۔ میرے علی، لڑکے علی۔“

”پانچ سو روپیہ صاحب، صرف ایک ٹھنڈے خوش
کردوں کا صاحب۔ بس پانچ سو روپیہ۔“ وہ بڑبڑا رہا
تھا۔

”علی۔“ وہ چلا اٹھی تھی۔



دس سال کے اس صحت مند گورے بچے اور ہنس
کھنچنے پہ الفت خان کی نظر عرصے سے جمی لیکن وہ
اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ علاقہ غیر
میں اس کا خاندان چار لاکھ روپے کا مقروض تھا۔ ایسا
قرضہ جو نسلوں سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
البتہ کمزور پرستھا چلا جا رہا تھا۔ وہ اور اس کے دونوں بھائی
لاہور اور کراچی میں دن رات جان توڑ محنت کے بعد
سود کی اس بھاری سسل کو ذرا سا پرے سرکانے کی
کوشش کرتے چالیس سال کے قریب عمر ہونے
کے باوجود اب تک الفت خان کی شادی بھی نہ ہو سکی
تھی۔ وجہ وہی قرضہ۔ اپنی فطری اور جائز خواہشات
کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے ہی جیسے دوستوں کا

ایسا نام نہ لیا اور میرا طبی راستہ تلاش کیا تھا لیکن اس
 ایسے معاملے میں مہاجرین میں کچھ سرکاری افسروں اور
 کاروباری افراد کی یہ بات مانتی تھی کہ اس میں کوئی
 ملے کے بعد اس کی سسٹم کا وہ مکرورہ بھی زندہ ہو گیا
 ہو لیکن یہ کہ چاہیے کہ اس کے دور میں اسے میرا تھا
 انجی خاصی تھی جس سے وہ ہاتھ نہیں دھوا چاہتا تھا
 مکرورہ کوئی صاحب تھے سبکی ہوں اور چھٹی جلد والا علی
 اس کے اندر کے شیطان کو انکار کرتا تھا۔

اس دور میں یہی سوال علی کے دوست اس کے
 ساتھ جیتے ہیں تھے کہ وہ نہ وہ ان پر اٹھتا علی
 ہو رہے کی وہ سے بار بار الفت خان کے کرو پھر
 کٹ رہا تھا۔ تاکہ اس سے باقی کر سکے اپنا دھیان
 برائے کے لیے الفت خان نے شے کی دینی مقداریتے
 کا تجربہ بھی کیا مگر اس کے حسن نگہ نہ خوفناک تھے
 شیطان اس پر حمل طور پر علوی ہو گیا وہ علی کو رہا
 پھل کے اپنے کو مارنے کیلئے نشہ آور دوا میں بھیجا
 ردیال اس دن سارا بچے کو ہوش سے بیگانہ کرنے کے
 لیے کئی قتل۔

مکرورہ الفت خان کو جب ہوش آیا تب تک شرم
 کے سائے گہرے ہو چکے تھے جلد تک کا دور ساریت
 کیپر اس کے ساتھ اس کو مارنے میں رہتا تھا اس کے
 تے کے بعد علی کو چھپانا ممکن ہو جاتا جواب تک
 بے ہوش رہا تھا اور اگر کسی کے تے سے پہلے علی کو
 ہی ہوش آیا تب بھی مشکل ہو جاتی۔ اس کی ماں کے
 داپس تے کے بعد اسے زخمی کرنے کا مل بھی شرم
 ہو جاتا ایسے میں الفت خان کو اپنا بھائی پریت خان یاد
 آیا۔ اس نے نزدیک ہی سی او سے فون کر کے اسے
 پھر لایا اور اسے کہہ دیا کہ اس کے تے سے پہلے علی
 کو بے ہوش کی دوا مزید استعمال نہ کی۔ پریت خان اسے
 اپنے ایک جاننے والے کے گھر میں لایا وہ کھانگ
 کی چھٹی کچھ سے فوار ہو گیا۔

یہاں سے علی صوبہ سرحد پہنچا پریت خان نے اس
 کو لکھنؤ لے گئے تاکہ وہ دوا کا مہولہ کے چار
 سالوں میں اس وقت شیطان کی ہوس کا نشانہ بننے کے

بعد وہ اس کے بچے چڑھ گیا اور میں سے رو بہ
 اس حال میں ملکر اس کے بچے کی کوئی امید نہ تھی۔
 مکرورہ کو دھمکیاں اسے فوری طور پر اسپتال داخل
 کر دیا۔ رو بہ اب تک ایسا نہ کر پائی تھی کہ علی
 کے ملنے کی اطلاع دینی میں کو بہت تھک
 "بچہ نہیں یہ ان کے لیے خوش خبری ہو گی یا۔"
 بچہ نہیں علی کو دیکھ کر وہ پھر سے ہی انہیں کی۔
 ایسا پھر جیتے ہی مر جائیں گی۔" سوچوں نے اسے
 نڈھال کر دیا تھا۔

 "تم میرا بچہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" شہنواز
 چلا آتا تھا۔

"تجسس نہ کرو۔ چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سوائے
 اس کے کہ اسی کا ہونگ پر جانے کی گور جو سوال لے
 کر میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں ان کے بھوں پہ بھی
 یہی سوال ہو گا۔ جب تک تم مجھے پوری بات نہیں
 کہ میں تمہارا بچہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"لیکن پوری بات؟ میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے
 اندھ کر جانے کی کوشش کی مگر حق نواز نے سختی سے
 اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ صوفے پہ کر لیا۔

"سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دو ورنہ میں
 یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے بڑے بھائی ہو۔"

"وہ تو تم بھول چکے ہو۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ
 میں کچھ نہیں جانتا کوئی تعلق نہیں ہے میرا سویرا سے
 تو تمہارا کیوں نہیں لیتے کیوں مجھے بچ کر رہے ہو۔"
 "میں تمہاری زبان سے لکے الفاظ کو نہیں تمہاری
 آنکھ کے خوف کو مانتا ہوں۔ یہ خوف ظاہر کر رہا ہے کہ
 تم اپنے اندر کوئی بچ چھپائے ہوئے ہو۔ ایک ایسا
 شرمناک بچہ۔"

"کوئی بات نہ کرو۔ کوئی بچ نہیں ہے میرے پاس۔
 مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

 "اللہ سے بھی نہیں؟" حق نواز نے اس کی

گھر میں انیس سال کے پوجا۔ وہ ایک دم غصہ ہو گیا۔
 "میرا دل کیسا تھا میری سورا سے شادی کے ذکر
 قیس پریشان کر گیا تھا۔ تم نے یہ کیوں کیا کہ وہ
 قیس پہچان جائے گی۔ کیا پہچان جائے گی وہ لو شاہ
 نواز آپ دیکھا تھا اس نے تمہیں کیا نو سال کی عمر
 میں دیکھا۔ توں جب تم پورے والد گئے تھے؟"
 "میں تو عمر سے پورے والد نہیں گیا۔" شاہ نواز
 نے سستے میں کہتے ہوئے سر ہلکا لیا۔

"ہاں میں جانتا ہوں سب جانتے ہیں کہ پہلے
 بہت شوق سے خالہ کے ہاں بھاگ بھاگ کر جاتے
 والے شاہ نواز نے ایک دم ہی وہاں جانا ترک کر دیا تھا۔
 مگر آخری بار تم اپنے انٹر کے امتحان دینے کے بعد
 چھٹیاں گزارنے وہاں گئے تھے۔ وہ اسی تحقیق کے بعد
 چلے گئے۔ یہ کہ کیا سورا کے ساتھ ہونے والا حادثہ
 بھی ایسی دنوں ہوا تھا یا۔ یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے
 کہ فعل ہونے والے لڑکے سے تمہارا مکمل بدلہ لیا
 نہیں؟"

"میری ٹلی سے دور کی سلام دعا بھی نہیں تھی۔" وہ
 جلدی سے کہہ اٹھا تو حق نواز کے لبوں پہ ایک مسک
 نکلی۔ "جیسی جیسی مسکراہٹ اٹلی۔"

"ٹلی۔ اتویہ پیام تھا اس جہنمی کلمہ۔"
 شاہ نواز بولیں پسا پسا جیسے اب اس کے پاس مزاحمت
 کرنے کی نہ سکت ہو نہ ہتھیار۔
 "میں۔ میرا یقین کرو میری کوئی گلطی نہیں۔ وہ
 ٹلی ہی میں تو۔"

"حق نواز حیدر سے اس کا لہجہ ہوا بیان سننے لگا۔

"میں آخری بار پورے والد تب گیا تھا جب میرا انٹر کا
 رزلٹ آئے۔ والد قلم چھینوں میں تھر مھا۔" بچا جان
 کے ہاں جیاد کرتے تھے اور میں خالہ کے پاس یہاں۔
 حالانکہ نہ تو خالہ امی کی سٹی بہن تھیں نہ ہی اس شہر
 میں میری کوئی گالھی سداں تھا۔ کن لڑکے کو لڑکیاں

مڑا۔" مجھ سے بالکل الگ تھے اس کے باوجود میں
 یہاں آتا رہتا کرتا تھا۔ نگہ میں میرے احساس
 برتری کو شکیں پہچانے کا بہت سا سلسلہ تھا۔ میرا
 لاہور سے آتا وہاں کے گلی میں پڑھتا میرا الب لہجہ۔
 میری انگریزی میرا لباس میرے ہوتے وہاں کے
 پیٹرو لڑکے مجھے بہت کہہ کے بلایا کرتے تھے میں بھی
 ان میں ہنسنے کے خود کو کسی ہیرو سے کم نہیں جانتا تھا۔
 اور یہی کمی تھیں۔ چھوڑ کے انہیں مزید حیرت کیا کرنا
 تھا۔ حالانکہ نہ تو میں کوئی کمیشن میں پڑھتا تھا نہ ہی
 ہمارے گھر کا حال بہت زیادہ اچھا اس تھا اس کے
 باوجود میں اپنا فرضی کرل فرینڈز کے ساتھ اپنے
 بلیک تعلقات پڑھا چڑھا کے بیان کرتا۔ جب کہ
 حقیقت میں میرا کسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ نہیں یہ
 عادت کیسے پروان چڑھی۔

ان دنوں میری ملاقات اس سے ہوئی۔ سورا سے
 نہیں بلکہ اس کی بیٹی بسن سے۔ وہ صدیق بھائی کی
 دکان پہ آئی تھی۔ میں فاس وقت اس دکان پہ گزارنا
 جہاں میرے پرستاروں اور دوستوں کا۔ لگا
 رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ آئی تو میں اکیلا تھا۔ وہ بہت
 حسین نہ تھی منفرد بھی نہ تھی جسے دیکھ کر آپ نظرس
 جھکا لیں یا چالیں۔ وہ ایسی لڑکی تھی نہ تھی شے دل
 ہی دل میں پسند کرتے رہنے کے باوجود آپ اس سے
 اظہار کرتے ہوئے ڈر میں یا جھجک جاسے۔ وہ ایک ایسی
 لڑکی تھی جو آپ کو کچھ کرنے اکھ کھنے کچھ مٹنے پہ
 آسکتی ہے۔ اس کی شوخی اور تیزی طراری نے ہی
 مجھے آکسایا۔ مجھے موقع ملا کہ میں اپنے دوستوں پہ
 ثابت کروں کہ میں صرف باتیں ہی نہیں بٹاتا بلکہ
 حتمی طور پہ لڑکیوں کو بھی میں کرنا جانتا ہوں۔ کچھ میری
 عمر بھی ویسی تھی کچھ ناخوئی اور صحبت کا قصہ۔ میں
 جلد اس سے بے تکلف ہو گیا۔

اس کے باک لڑکی نے میرے اندر جذبات کی کونج
 دکا کر ہاتھ پھینچ لیا۔ بہت برا کیا اس نے۔ سورت میں برا
 نہ تھا۔ وہ میرے ہاتھ کھیل رہی تھی۔ الو بتا رہی تھی
 مجھے۔ جن دوستوں کے سامنے میں ذہنی طور پہ

اس ہی کے سامنے وہ مجھے تھمہ رہا تھی۔ غلی نے مجھے بدلا
 لینے پر اٹھ لیا۔ اور۔ اور۔ اس کی پھولی بہن کو بہلا
 بھلا کے اپنی دکان لے گیا۔ میں کچ کر رہا ہوں
 میری نہ تو انکی نیت تھی نہ یہ پلان۔ غلی نو بد نیت تھا
 اور اپنی غرض سے ایسا کر رہا تھا اور اسان وہ مجھ سے جتنا رہا
 تھا میں نے منع کیا۔ روکنا چاہا اسے مگر تب وہ
 اس کے ہاتھ پیر ہاتھ کے اس کے منہ میں پیراٹھوٹس
 دیا تھا۔ میں ہری طرح پھنس گیا۔ اس نے ایک ایسی
 ٹھہرا لگی جس سے میرے پیٹ کی ہڈیات ہلنے لگیں
 میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر اس بچی کی کم سنی
 آٹھوں کا ہر اس میں کچھ نہ کچھ سا کھانا تھا۔
 میں ہوش میں آیا۔ مجھے اپنے آپ سے غصہ
 آئی۔ مجھے۔ مجھے اس بچی کی جگہ فوری نظر آئی۔ میں
 نے غلی کو بیت والا جو اس وقت درندہ بن رہا تھا۔ وہ
 میرے قابو میں نہ آیا تو میں وہاں سے بھاگ نکلا۔
 راستے میں صدیق بھائی ملے تو انہیں وہابی کہتا کر
 لاہور آ گیا۔ اور۔ اور۔ ساروں سے میرے دل سے
 یہ طمان نہیں جاتا۔ یہ پچھتاوا نہیں جاتا۔ کاش۔ کاش
 میں نے غلی کو تب روکا ہوتا۔ تب وہ اس بچی کو بہلانے
 سے اندر لا رہا تھا۔
 کاش میں صدیق بھائی کو لے کر غلی کی دکان تک
 واپس چلا جاتا۔ اس بچی کو بچا لیتا۔
 کاش۔ کاش۔ مگر میرا یقین کرو حق نواز میں نے
 کچھ نہیں کیا۔ تب اس نے وہاں سے اس بچی پر غلط نگاہ
 ڈالتے تھا نہ ہی میں اسے اندر لانا چاہتا تھا۔ ہاں چند
 بے اس کو بیٹے والے لمحات میں میں نفس کا غلام
 بن گیا۔ اس نے اس کے لیے سچے سچے ہونے کی بات
 کہ اسے بھولنے کے لئے کار ہوئے تھے تب سے
 میں اسے بھول گیا۔ لیکن وہ اب اس کا نام
 اس کی جگہ پر نہیں ہے۔ غلی کی غرض کہ
 اپنے قریب نہ چھٹے۔ تم کو وہ میری پارسل
 کے۔ وہ ملک افلا۔
 کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے شہ نواز کے ہمدان کے ساتھ
 اکثر ہمدان کے غیر معمولی طرز عمل کی وجہ سے

کوشش کیا کہ کرم قتل ہمدان سے بچا ہوا ہے۔
 دکان پانی ٹپا کی کا جھونکا ہوا ہے اور موت کے
 بارے میں کچھ خیالات۔ یہ سب قتل کے بعد کی
 انسانی کردہ تھی۔ دراصل تم اپنا پارسل جیت نہیں
 کر رہے تھے۔ بلکہ اپنے دماغ سے کھینچی تھات
 دھونے کی کوشش کرتے رہے۔ اور ہمدان کے مرض
 ایسی اور بڑے کا شہ نواز۔ اب جب تم اپنی آنکھوں
 سے یہ دیکھ چکے ہو کہ اس بے گناہ بچی نے قتل کی
 سے یہی زندگی گزار رہی ہے۔ مگر اس کی آری ہے اور
 آئندہ گزارنے والی ہے۔ تم یہ جان چکے ہو کہ اس
 پورے خاندان پر کیا زور چکی ہے۔ اب تم کی طرف
 سے۔ سسکو کے مگر نجات میں حاصل کر سکو
 گے۔ اس احساس گناہ سے تم کتنا ہی چلا چلا کے کیوں
 نہ اعلان کرو کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تم بھی جانتے
 ہو کہ تم کیا کر چکے ہو۔
 "میں کیا کروں۔ کیا کروں جو میری ذات سے یہ
 داغ دھل جائے میری روح بھلی پھلی ہو جائے۔"
 کر رہا۔
 "تمہارے کو شہ نواز لہو میں کرنے جا رہا تھا۔ یہ فرض
 تو تمہیں لوار کرتا ہے۔ اور اگر تم نے قدم آگے نہ
 بڑھائے تو سمجھو پچھتوے کے تاک بیٹ بیٹ کے
 لیے گلے میں ڈال لیے ہیں۔ اب غلی کی بیک ایک
 صورت بنی گئی۔
 "میں کیسے اس سے شادی کر لوں اپنی نہیں مانی
 کہ۔ لہذا کیا سوچیں گے یہ دنیا کیا ہے کی؟"
 "اور اللہ۔ اللہ کے بارے میں سوچو شہ نواز
 شہ نواز ہمدان کے اپنی اقدام سے وہ ہمدان کے بارے میں
 رعایت کر ڈالے میں تو یہ کام بھی سمجھ کے کرتے
 جا رہا تھا۔ وہاں سے کاش۔ مگر تمہیں تو اللہ کے
 طور پر چکر رہا ہے۔ اس نے دماغ سے اسے سمجھا
 تھا۔
 حق نواز نے ہمدان کے شادی کی بات کر

سورہ کے ساتھ ہونے والے معاملے میں دوسری شریک
 تھی۔
 تفسیر یحییٰ عریک کی طرف ملاحظہ کی دو کریمہ آئیں۔
 ایک بار پھر بنی آدم کے ساتھ انمول سے اپنے بڑے
 بیٹے کا ہونے والا جو ان کا بیٹا تھا، تو یہ تھا۔ نور
 تھا۔ ان کا بیٹا ہوا اور یہ تھا۔ ان دو بھائیوں کا اہتمام ہوا
 چاہئے کہ ان کے عملی معنی سکھایں دیتے تھے۔
 میں نے کہا تھا کہ میں یہ صورت حال براہ راست
 میں کر رہا ہوں۔ جی ہاں۔ اسی شرمندگی کے لئے
 کہ میں نے یہ سمجھا تھا۔ ابھی تو ان کو ان کے ہاں سے
 جانے کی تائید نہیں ہو پا رہی تھی۔ "شک نہ کرنا کہ وہ
 کہیں ہیں کہ رہا تھا۔

"میں وہاں نہیں جا رہا ہوں۔ کیا ماننے کے کہ جاؤں
 کیسے اپنے بیٹے کے کہوت کھاؤں مجھے تو وہاں رکھو
 انہوں نے ساتھ دیا۔"

"فی الحال اس سیدنی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام
 لے کر اس تک کام کا آغاز کیجئے اور شہادوں اور تحسین
 قریب از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس
 لئے کہ ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ سورہ کے تحسین
 پہچاننے کے امکانات صفر میں کیونکہ تم کہتے ہو کہ
 تم وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر اللہ نے تمہارا ہر وہ
 رکھنا چاہا اور تمہارے کفار سے کوئی تمہاری توبہ کو شرف
 قبولیت بخشا تو بغیر اس کے ساتھ عیاں ہوئے بھی تم
 وہاں آئے تھے۔ ایک خوش گواہ زندگی گزارو
 گے۔ ہوئے تو وہ دونوں کچھ عرصے کے لئے نہیں اور
 شفقت ہو جائے۔ وقت سب سے بڑا مہم ہے۔ حق

ہوئی جس طرح کہ حق تو ان کے دماغ سے پوچھا۔
 آج تھے ان کے بعد وہاں سے وہاں تھے۔
 ان کے کہیں تم کو کسی بھی چیز کے لئے نہیں
 آ رہے تھے۔" دماغ نے مسکراتی ہی کام

آج تھے ان کے بعد وہاں سے وہاں تھے۔
 ان کے کہیں تم کو کسی بھی چیز کے لئے نہیں
 آ رہے تھے۔" دماغ نے مسکراتی ہی کام

کو شش کی۔ "میرا نہیں کچھ کر فتنہ تک تک کہہ دیتے
 تھے۔"

"وہ ایک ہی چیز تھی۔ میں تم سے کچھ نہیں رہا تھا
 کہہ کہہ منسلک کے ساتھ صرف وہاں سے صرف وہ
 اہل اور اس کے بعد سے میں مسلسل تحسین عاریت
 کر رہا ہوں۔ انہیں یہاں نہیں آ رہیں مگر انہوں نے فراموش
 ہو گئی۔ کیا اس بارے میں تمہارے ہیں تمہارے؟"
 جواب میں دماغ نے اسے ساری کھلی دیا
 اہل۔ علی کے لئے اس کے لئے کہ اس کے لئے
 چار سالوں تک کی ساری داستان۔

"میں بہت الجھتی ہوں۔ کچھ میں نہیں کر رہا تھا
 کروں۔ علی کے لئے انصاف طلب کروں یا ماما کو ان کا
 بیٹا ہو جائے۔ ماما نے چار سالوں تک علی کی بددلتی بہت
 مشکل سے برداشت کی ہے اب وہ اس کا یہ علی دیکھ
 نہیں رہا ہے۔ وہ ساری جہت میں ان سے یہ بات چیت
 بھی نہیں پارتی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر میں نے ماما
 علی کے بارے میں بتا دیا تو مجھے اس کی خاطر انصاف
 کی جنگ لڑنے کا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ ماما یہ برداشت
 نہیں کریں گی کہ ان کا مظلوم بیٹا جو چار سال تک رہا
 رہا۔ اب اس کی کہانی اخباروں کی ذمت بنے۔ لوگ
 چپکے لے لے کر پڑھیں۔ چار لفظ ہر روز کے کہیں
 اور پھر اسے دیکھ گئے ناک۔ یہ دماغ رکھتے ہوئے اوپر
 اوپر ہو جائیں۔ وہ یہی چاہیں گی کہ ان کی زندگی کے کہانی
 میں علی کے ہر اس سن اور اہمیت سے لڑیں۔"
 "اور تحسین میں ان کی خواہش پوری کرنی چاہیے۔"

"مجھ میں کوئی بھی ذکر رکھو اور معصوم بچوں کی
 زندگی میں کچھ ایسا کرنے کا موقع دیتے ہوئے اپنی اپنی
 ذمہ داری اہمیت سے گزاریں؟ ایسا کیسے کرتے
 تھے کہ انصاف کی راہ پر چلتا مشکل سہی مگر ضروری

"فی الحال ایک ماں کے جذبات کا احترام کرنا
 ضروری ہے کہ کیا یہ سب ہے کہ علی کے بچوں کو
 انصاف کی بات ہے کہ تم ساری عمر میں ان کا ساتھ دے
 گے کہ ان کے لئے جاننا کہ ان کا انصاف خود

میں جانتے تھے۔
 "میں جانتی ہوں تمہاری دماغی سہ تیز ہوتی ہے۔"
 "نہیں سہ، مجھ تو سب کا دوسرا نام کیا ہے صحت مند اور

مطلوبہ۔
 "میری طبیعت کا اندازہ کرو۔ آج کی طبیعت
 قلب میں رہتی ہے اس میں طبیعت کی ضرورت ہے اور طبیعت کو
 ایک لمحہ ایک لمحہ ہی کہ اسے بھی سب سے طالع
 اچھی ہے۔ بہتر ماحول اور صحت تو یہ بہت چاہیے۔
 میرا وہ ستارہ مشورہ تو یہی ہے کہ فی الحال نہیں لڑنے کا
 ارادہ ہو کر کرو۔ اس لیے جان کی اہمیت سب سے زیادہ
 ہے جس کی حالت سنبھل جائے تو بعد میں آجی کو
 اندر میں لے کر سب کچھ بتا دیتا۔"

"تھک ہے۔" ایک پارک میں میری بات مانی تھی
 "اب میں تمہاری بات مانتی ہوں۔"

"میں سویرا سے شادی کی بات مجھے بہت خوشی
 ہوئی تھی یہ جان کر آجی کا فون آیا تھا مجھے۔"

"ہاں وہ سب۔" وہ لہلہ کے ہوا۔
 "وہ ایک حربہ تھا۔ سویرا سے شادی ضرور ہو رہی
 ہے مگر میری نہیں شادی ہوئی۔ اگلے چلتے سادگی سے
 لائی ہو گئی البتہ ویر کا حکومت نامہ کل تک پہنچ جائے
 گی۔"

"میں نے رو میصد یہ ظاہر کیا ہے اس نے سویرا
 سے شادی کرنے کا شوق شادی کو اس نے اس نے

پھر پھر اس کی اور سے شادی کیے کر سکتا ہوں
 صحت میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے
 "ابھی تو میری ہی بات چاہی تھی کہ ساتھ لگا کر جس دیکھا
 "اگر ابھی رو میصد کے اطراف میں نہیں
 پہنچا تو اس نے عمر کی۔"

پچھلے تھا۔ آج شادی اور سویرا اپنے ایک خوش
 حال زندگی گزار رہے ہیں۔ شادی کرنے کے بعد وہ
 بہت خوش ہوئے تھے سویرا کو زندگی کی ہر ممکن خوشی
 میسر کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ نے میں سویرا کے
 چہرے پر پھر لٹی ہوئی ہے اس کا سانس گنتہ کہم سے کم
 کرتی جاتی ہے۔

میں رفتہ رفتہ زندگی کی جانب لوٹ رہا ہے اس کا
 جسمانی اور نفسیاتی دونوں طرح کا علاج جاری ہے۔
 مصلحتاً مسز بیو فریڈ سے اس کے گھر سے چار سہل کا
 انہماک پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ صرف اس کی گمشدگی کے
 بارے میں الفت خان کا ذکر کیا گیا۔ وہ رو میصد کے
 منع کرنے کے باوجود اس لمحہ تک میں جا کے رہی۔
 وہیں سے الفت خان کے بارے میں معلومات لے کر
 اس سے ملنے گئیں مگر اس سے اپنے بیٹے کی پریشانی کا
 حساب مانگ سکیں اور وہیں جا کر رو میصد کو حق تواریکی
 بات شہادت سے یاد تھی۔ "اللہ سے بیڑا منسلک ہوئی
 نہیں۔" الفت خانی بیٹا یوں کا گڑھ بن کے رہ چکا تھا۔
 اس کا گھر سزا جسم حقین پہنچا رہا تھا۔ وہ نہ کچھ کہنے سننے
 کے قابل تھا نہ اس سے بچنے کے۔

رو میصد نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ وہ ابھی
 میں کی خاطر طبیعت کے لیے انصاف کی دیکھتے تو نہ اس کی عمر
 فرزند ہو رہی کے ساتھ مل کے معاشرے کے ان
 بے تعمیر افراد کے خلاف جہاد ضرور کر رہی ہے۔ جو چین اور
 معصومیت کو کبھی نہ ختم ہونے والا روگ لکھتے

پھر پھر اس کی اور سے شادی کیے کر سکتا ہوں
 "اور حق تو ان۔ حق تو ان صرف ہم کا ہی حق تو ان تو
 نہیں فوج کی اس بددعا میں کتنے بھی رو میصد کے
 ساتھ ہے۔"

پھر پھر اس کی اور سے شادی کیے کر سکتا ہوں
 "اور حق تو ان۔ حق تو ان صرف ہم کا ہی حق تو ان تو
 نہیں فوج کی اس بددعا میں کتنے بھی رو میصد کے
 ساتھ ہے۔"